ڈھشما

نیئر مصطفیٰ

نیر مصطفیٰ پوری طاقت سے عصرِ حاضر کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کا تخلیقی سفر بہت طویل ہے۔ وہ ''تر کھ میں نرتکی'' میں ایک ایسا ولن نظر آتا ہے جو زمانے کو اپنے مطابق دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے لیے ولن کا کردار منتخب کرتا ہے کیونکہ اسے ہیرو کے شبد سے چڑ ہے۔ وہ لڑنا چاہتا ہے مگر مدمقابل کے چہرے پہ جمی دھند کو دیکھ کر اپنے بال نوچتا ہے۔ پھر وہ سنبھل جاتا ہے اور ذرا رک کر ''ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی فیکٹری'' لکھتا ہے، جس کی اشاعت اردو افسانے کو بہت سی نئی جہات عطا کرتی ہے۔ ''ڈھشما'' تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنا مچور ہو جاتا ہے کہ ایک جملے سے بائنڈنگ تصورات توڑ دیتا ہے اور ایک جنکارے سے میٹا نیریٹوز کو ہوا میں اڑا دیتا ہے۔ وہ ایک ایسا کوزہ گر بن جاتا ہے جو چاک کو ہر سمت گھماتا ہے یہاں تک کہ سورج بھونڈے طریقے سے مغرب سے طلوع ہوتا ہے اور شرمندہ سا ہو کر مشرق میں گرا نظر آتا ہے۔

عثمان علی

اس صدی کے آغاز میں اُبھرنے والی وہ آوازیں، جو اُس وقت مشکوک لگتی تھیں، آج اعتبار پا چکی ہیں کہ موجودہ صدی ناول کی صدی ہے۔ عالمی منظرنامے کے متوازی مقامی سطح پر بھی منفرد، پختہ اور بڑے ناولوں کی مسلسل آمد یہ باور کرا چکی ہے کہ اس عہد میں فکشن کے قاری کو اچھے ناول میسر آتے رہیں گے، جب کہ فکشن کے قاری پیدا کرنے اور اُن کی فکری و ادبی تربیت کی ذمہ داری ناول نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جہاں ''حسن کی صورتحال''، ''خس و خاشاک زمانے''، ''زینہ''، ''گل مینہ''، ''موت کی کتاب'' اور ''چار درویش اور ایک کچھوا'' ایسے کئی ناول اپنا نقش قائم کر کے نئے ناول کی شعریت کے حوالے سے ایک ڈسکورس قائم کر چکے ہیں وہیں نیر مصطفیٰ کا ''ڈھشما'' تیسری دہائی کی دہلیز پہ کھڑا دستک دے رہا ہے اور جہاں سے مباحث کو آگے بڑھانے کی دعوت بھی۔

راشد سعیدی

ڈھشما

(ڈرامہ - ناولٹ)

نیر مصطفیٰ

CITY BOOK POINT
Naveed Square.Urdu Bazzar, Karachi
E-Mail: citybookurdubazaar@gmail.com

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

بار دوم: نومبر ۲۰۲۱ء

کتاب کا نام: دھشما

مصنف: نیر مصطفیٰ

سرورق: جواد جوجی/کاف نون

کمپوزنگ: سخن سرائے، ملتان
0301-7434323

پروف ریڈنگ: قاضی علی/عاقب قریشی

ناشر: سٹی بک پوائنٹ، کراچی

تعداد: پانچ سو

قیمت: ۳۵۰ روپے

رابطہ: nayyermustafa@hotmail.com
Ph: # 0331-7045748

انتساب!

''مستقبل کے اُس انسان'' کے نام!
جو کائنات کو جبر، جمود اور عدم مساوات کی بیڑیوں سے رہائی دلائے گا

When life itself seems lunatic, who knows
where madness lies.
Perhaps to be too practical is madness.
To surrender dreams — this may be madness.
Too much sanity may be madness —
and maddest of all:to see life as it is, and not
as it should be!

(Cervantes, Don Quixote)

فہرست

ڈھشما۔ سودائیوں کا جہاں

وقت ایک اضافی شے ہے
ہم پھر بھی حساب رکھتے ہیں
اکیسویں صدی کے دو عشرے گزر گئے
ہم جانتے ہیں کہ
کچھ بھی جاننا ممکن نہیں
پھر بھی ہم ایک دوسرے کو
جاہل قرار دیتے ہیں
میٹا نیریٹیوز ٹوٹ کر بکھر گئے
جس کے ٹکڑے امیبا کی طرح بڑھ رہے ہیں
ہر صبح ایک نیا نظریہ لاتی ہے

آزادی کو یقینی بنانے کے لیے

روزانہ قانون سازی ہوتی ہے

انکار کے سوا

اب کوئی رومانس نہیں رہا

انکار۔ دوسروں کے ہونے کا

انکار۔ اپنے ہونے کا

منافع خوروں کے سوا سب سوچتے رہتے ہیں

دنیا کو سنوارنے والے

ہاتھ میں برش لیے کھڑے ہیں

مگر رنگوں کی پہچان نہیں رہی

گانے والا کوئی راگ چھیڑتا ہے

مگر اس شور میں

اسے اپنی آواز سنائی نہیں دیتی

پوسٹ ماڈرنزم ختم ہوا

اب جو ہے وہ بہت پرانا ہے

ایک ناخالص پتھر کا زمانہ

....

ڈھشما

کوئی معنی نہیں

کوئی سچ نہیں

کچھ حتمی نہیں

مکاں تو سامنے ہے

زمانہ بھی لوٹ آتا ہے اچانک

کسی بہروپیے کی طرح

نیرؔ مصطفی ایک سرپنچ ہے

جو پنچایت بُلا کر غائب ہو جاتا ہے

فلسفوں کا تصادم ہوتا ہے

فلسفی اُلجھتے ہیں

سب فلسفے ہار جاتے ہیں

فلسفی جیت جاتے ہیں

احمق ان پہ ہنستا ہے

جس کی بغل میں کوئی کتاب نہیں

ذہن میں کوئی فلسفہ نہیں

ہاتھ میں ایک کلہاڑا ہے

جس پر نیلی آنکھوں والا بندر کندہ ہے

....

مکالمہ رُکتا نہیں ہے

جنوں کا ابلاغ ہوتا ہے

فلسفی جذباتی ہو جاتا ہے

فلسفی شدت پسند بھی ہے

فلسفی انسان ہے

تہذیبیں Overlap ہوتی ہیں

آوازوں کا راج ہے
مختلف نظریات کو
غصے نے یکجا کر دیا ہے
کرہ بے ترتیب گھومتا ہے
نہ مشرق، نہ کوئی مغرب، نہ شمال، نہ جنوب
کوئی سمت نہیں ہے
رٹا ہوا سبق دہرایا جاتا ہے
ہنگامہ برپا ہوتا ہے
زندگی کا احساس ہوتا ہے
موت کا یقیں ہوتا ہے

....

نروان
ہٹلر بدھا نازی نروان
کہیں آسن مارے بیٹھا جا سکتا ہے
سب جنگل ہے
دکھی ہونا آسان نہیں ہوتا
سکھ میں نروان نہیں ملتا
ماضی آگے سرکتا ہے
مستقبل پیچھے چھلانگ لگاتا ہے
حال تو کہیں موجود نہیں
ہٹلر۔ تمام دکھ ہے

بدھا۔ Sieg Heil

....

سنگل آوٹ میلو ڈرامہ

پتھر پگھل کر بھی پانی نہیں ہوتا

پانی منجمد ہو کر بھی پتھر نہیں بنتا

جینے کے لیے

تقسیم ضروری ہے

نظریہ دلیل سے نہیں

طاقت اور ہٹ دھرمی سے قائم رہتا ہے

عورت کمزور ہے

عورت مرد سے نفرت کرتی ہے

عورت اگلے جنم میں مرد بننا چاہتی ہے

کالے خود پہ فخر کرتے ہیں

کالے گوروں سے نفرت کرتے ہیں

کالے گوروں کو اسی جنم میں

کالا دیکھنا چاہتے ہیں

عثمان علی

(ملتان)

اگست، دو ہزار بیس

نیرّ مصطفیٰ کا ''ڈھشما'': ایک پوسٹ ماڈرن ناول

اِس صدی کے آغاز میں اُبھرنے والی وہ آوازیں، جو اُس وقت مشکوک لگتی تھیں، آج اعتبار پا چکی ہیں کہ موجودہ صدی ناول کی صدی ہے۔ عالمی منظر نامے کے متوازی مقامی سطح پر بھی منفرد، پختہ اور بڑے ناولوں کی مسلسل آمد یہ باور کرا چکی ہے کہ اس عہد میں فکشن کے قاری کو اچھے ناول میسر آتے رہیں گے، جب کہ فکشن کے قاری پیدا کرنے اور اُن کی فکری و ادبی تربیت کی ذمہ داری ناول نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جہاں ''حسن کی صورتحال''، خس و خاشاک زمانے''، ''زینہ''، ''گلِ مینہ''، ''موت کی کتاب'' اور ''چار درویش اور ایک کچھوا'' ایسے کئی ناول اپنا نقش قائم کر کے نئے ناول کی شعریات کے حوالے سے ایک ڈسکورس قائم کر چکے ہیں وہیں نیرّ مصطفیٰ کا ''ڈھشما'' تیسری دہائی کی دہلیز پر کھڑا دستک دے رہا ہے اور جاری مباحث کو آگے بڑھانے کی دعوت بھی۔

نیرؔ مصطفیٰ نوجوان ضرور ہیں تاہم دنیائے فکشن میں اُن کا نام مبتدیوں میں نہیں، کہ اُن کا فکشن سے تعلق دو دہائیوں کا سفر طے کر چکا ہے۔ انتظامی عہدے پر فائز، سیاسی و سماجی علوم کے سنجیدہ معلم و متعلم نیرؔ مصطفیٰ ''کولاج'' کے نام سے ملتان آرٹس فورم کے اجلاسوں کی روداد اپنے مخصوص تخلیقی انداز میں منظر عام پر لا چکے ہیں، اِس کے ساتھ ان کے دو افسانوی مجموعے (''نرکھ میں نرتکی'' اور ''ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی فیکٹری'') اُنہیں ایک ٹیبو شکن، باغی اور منفرد افسانہ نگار تسلیم کرا چکے ہیں۔ اُن کی تخلیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ادب کو سماجی تعلق سے جدا دیکھنے کے قائل نہیں۔ اُن کا تخلیقی عمل گہرے سیاسی، سماجی اور ادبی شعور کے رچاؤ سے تشکیل پاتا ہے، جس سے اُن کی تخلیق ہمہ گوں معنی پاشی کی حامل ٹھہرتی ہے۔ ''ڈھشما'' میں اُن کے فنی و فکری شعور کی وسعت کا بہر طور اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات کہنے میں اب کوئی باک نہیں ہم سب پوسٹ ماڈرن عہد میں جی رہے ہیں۔ پوسٹ ماڈرنزم اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو طرح کی ہے۔ ماڈرنزم کے زیرِ سایہ پنپنے والے سرمایہ دارانہ نظام اور اس سے متعلق فری مارکیٹ اکانومی، کنزیومرزم کی زائدہ اور متاثرہ صورت حال۔ انتشار، بے راہ روی، لامرکزیت اور لایعنیت اس پوسٹ ماڈرن کنڈیشن کے بنیادی خصائص ہیں۔ دوسری طرف وہ تمام نظریات و افکار جو درج بالا صورت حال کی تفہیم، تشکیل، حمایت یا مخالفت پر بنیاد رکھتے ہیں بنیادی طور پر پوسٹ ماڈرن تھیوری کہلاتے ہیں۔ پوسٹ ماڈرنزم سے ہمارے ادیبوں کا تعلق بھی دو طرح کا ہے۔ کچھ ادیب شعوری یا لاشعوری سطح پر گلوبلائزیشن، کنزیومرزم اور ہائپر رئیلٹی وغیرہ ایسے مظاہر سے متاثر ہوتے ہیں اور

اپنے مافی ضمیر کا اظہار فکشن یا شاعری کی تخلیق کی صورت میں کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے وہ ادیب جو پوسٹ ماڈرنزم کی تفہیم، مضمرات اور تعینات تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور بصورتِ تنقید اپنے تبحرِ علمی کا اظہار کرتے ہیں۔ نیرّ مصطفی کا معاملہ ہر دو ادباء سے جدا ہے کہ وہ پوسٹ ماڈرنزم سے متاثر ہونے کی بجائے اس کی فکری، سیاسی اور ادبی بنیادوں اور حدود سے آگہی کے بعد اِس کے اظہار کے لیے تنقید کے بجائے تخلیق کا راستہ چنتے ہیں اور گنجلک سیاسی اور فلسفیانہ مباحث کو اپنے ناول ''ڈھشما'' میں منقلب کر دیتے ہیں۔

یوں تو بقول مرزا اطہر بیگ ہر اچھے اور بڑے ناول کی بنیاد ایک تجربہ ہوتا ہے، لیکن ''ڈھشما'' کا معاملہ کچھ اس طور بھی مختلف ہے کہ اس کی بنیاد ایک نہیں بلکہ کئی تجربات پر رکھی گئی ہے۔ اس کی ہیئت، پلاٹ، کردار، تکنیک، زبان بھی اپنے طور پر منفرد مگر پرلطف تجربہ ہی ہیں۔ ''ڈھشما'' اپنی ہیئت کے لحاظ سے ڈرامہ اور ضخامت کے لحاظ سے ناولٹ معلوم ہوتا ہے جبکہ اِس کی معنوی پرتیں اور فکری وسعتیں اس کو ناول بلکہ اچھا ناول ثابت کرتی نظر آتی ہیں۔ تھیئٹر آف ابسرڈ کی تکنیک میں لکھے گئے اس ناول کا مکانی دائرہ اگرچہ امریکہ کے شہر نیو یارک کے ایک انڈر گراؤنڈ ملٹی پلیکس سنیما اور چند گلیوں تک محدود ہے تاہم زمانی دائرہ تین ہزار سال سے زائد عرصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نیرّ مصطفی نے ناول کی زمانی وسعت کے تعین کے لیے Temporal Distortion کے بجائے نہایت منفرد انداز یہ اپنایا ہے کہ مختلف زمانوں سے متعلق کرداروں کو یکجا کر دیا ہے۔ ناول کے تمام کردار بذاتِ الگ الگ نظریات کے حامل ہیں جن کا کسی ناول میں اکٹھا ہونا کئی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ جیسے بدھ مت کے بانی

اور عدم تشدد کے پیام بر گوتم بدھ، انقلابِ فرانس کے روح و رواں والٹئیر، سوشلزم کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے والے اطالوی فلسفی انٹونیو گرامچی، لاکھوں یہودیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والا ہٹلر، پس ساختیاتی فکر کا بنیاد گزار رولاں بارتھ ،تانیثیت کو بطور ایک ہمہ گیر فکری تحریک میں ڈھالنے والی سیمون ڈی بوائر، مغرب کے سامنے مشرق کی بات کرنے اور مابعد نو آبادیاتی مطالعات کی بنیاد رکھنے والا ایڈورڈ سعید، بیسویں صدی کے اختتام پر ''Clash of Civilization'' سے متعارف کرانے والا سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تشدد کے تسلسل کا امین اور دنیا کو بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دینے والا ڈونلڈ ٹرمپ اور سیکولر ہندوستان کو شدت پسند ہندو راشٹر میں بدلنے والا نریندر مودی۔

اگر چہ ناول ''ڈھشما'' میں کہانی کا عنصر بھی اپنی جگہ موجود اور اہم ہے تاہم زیادہ اہمیت مکالموں اور اُن سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو حاصل ہے۔ ناول کا ہر جملہ گنجینۂ معانی کا طلسم کہلانے کا حقدار ہے۔ ناول کے پہلے باب ''فلسفوں کا تصادم'' میں تمام کردار ''ڈھشما'' نامی اینی میٹڈ فلم کا پریمیئر شو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، جس کا مرکزی خیال ہنٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' سے ماخوذ ہے۔ امریکی تھنک ٹینک سے منسلک وہی ہنٹنگٹن جس نے کولڈ وار کے اختتام پر، جب دنیا امنِ عالم کا سوچ رہی تھی، تہذیبی تصادم کے نام پر امریکہ کو جنگوں کے اہداف (عراق، افغانستان وغیرہ) طے کر کے دیئے۔ ناول نگار نے کمال مہارت سے ہنٹنگٹن کو اپنی تمام تر خصلتوں (ڈونلڈ ٹرمپ کی گالوں اور بغلوں کو گدگداتے) اور افکار (امریکن پپو کا عراقی باگڑ بلوں اور افغانی ریچھ کو تہس نہس کرنا) سمیت دکھایا ہے۔ پہلے باب ہی میں ایڈورڈ

سعید، گرامچی اور سیمون کے مکالمے جہاں اُن کے نظریات کی توضیح کرتے نظر آتے ہیں وہیں اُن کی ذاتی سرگرمیاں اور باہمی کشاکش ایک عجیب لایعنیت کو جنم دیتی ہے جو عہدِ حاظر کا خاصہ بھی ہے۔

رولاں بارتھ ایسے شعبدہ باز فلسفی کا ''ڈھشما'' میں کردار معنی خیز بھی ہے اور مضحک بھی۔ معنی کے ساتھ اقدار، جنگ اور امن ایسی اقدار کو اضافیت قرار دے کر طاقت کے مراکز کو تحفظ فراہم کرنے والے رولاں بارتھ کے ناول کے دوسرے باب ''جنون کا ابلاغ'' میں مکالمے لامرکزیت، لایعنیت کی حامل پوسٹ ماڈرن صورتِ حال کا واضح مظہر ہیں۔ اس باب میں جہاں اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جنون کا ابلاغ ممکن بھی ہے کہ نہیں؟ وہیں ناول نگار دیوانگی وفرزانگی میں مبتلا کرداروں کے ذریعے بین التونیت کے حامل ایسے مکالمے سامنے لاتے ہیں جو معانی آفرینی کے در وا کرتے چلے جاتے ہیں۔

گوتم بدھ کی اپنی ذات وصفات سمیت اکیسویں صدی میں موجودگی ایک فکر انگیز امر ہے مستزاد یہ کہ تیسرے باب ''ہٹلر بدھا نازی نروان'' میں ہٹلر ایسا شخص نروان کی تلاش میں بدھ کا بھگت بنتا ہے تاہم عصری بے سمتی اور لایعنی صورتِ حال گوتم بدھ کو بھی نروان سے محروم کر دیتی ہے بالآخر وہ تشکیلی سچ کے زیرِ اثر نروان کو چنگ سنٹر اور نروان گروپ آف کالجز بنا کر روحانیت تیاگ کر کمرشلزم اختیار کر کے عصری تقاضے نبھاتے ہیں۔

''ڈھشما'' کا چوتھا باب بھی ''ڈھشما'' ہی کے عنوان سے موجود ہے، جس میں play in the play کی تکنیک اپناتے ہوئے ناول کے اندر اپنی میٹڈ فلم دکھائی جاتی ہے

جو اپنی نوعیت میں طاقت اور غلبے کی امریکن پالیسی کی دلچسپ عکاسی کرتی ہے۔فلم کا مرکزی کردار امریکی فوجی پپو (لنگور) عراقی باگڑ بلوں اور اور افغانی ریچھ کے قبضے میں موجود مغویہ مس ہوائی (بندریا) کو چھڑانے کے لیے جاتا ہے اور ''درندہ صفت'' اغوا کاروں کو، اُن کے تمام متعلقین سمیت، تہہ و بالا کر کے آدم خور درختوں کے نیچے ڈال دیتا ہے۔ تاہم دلچسپ امر یہ ہے کہ ظالم مشرقیوں کے نرغے میں ہونے کے باوجود مس ہوائی اُن سے پانچ ہزار ڈالر اور کٹ کیٹ چاکلیٹوں کا ڈبہ مانگ کر کمرشلزم کا ثبوت دیتے ہوئے پروڈیوسر اور کنزیومر کا فرق بھی واضح کرتی نظر آتی ہے۔اسی باب میں ''ننھے منے کیوٹ ہاتھی'' (بھارتی) اور ''دیوہیکل خونخوار خرگوش'' (کشمیری) اپنی سطح پر معنی خیز استعارے ہیں جو امریکہ کی ہندوؤں سے التفات اور مسلمانوں سے تعصب کی انتہا کا ثبوت فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔

''ڈھشما'' کا پانچواں اور آخری باب ''سنگل آرٹ میلو ڈرامہ'' ہے۔اس باب میں پریمیئر پر موجود تمام کردار فلم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اور اسی مقصد کے تحت بولے گئے ان کے مکالمے ان کے نظریاتی مافی الضمیر اور آپسی اختلافات کا اظہار بھی ہیں۔معروف مابعد جدید مفکر مشل فوکو اگرچہ ''ڈھشما'' میں بطور کردار شامل نہیں تاہم اُس کے نظریات ، بالخصوص پاور ڈسکورس کا نظریہ ناول میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کا ہر دم ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ رہنا اور ٹرمپ کا بھی اُسے ہر نوعیت کے تعاون ،حتیٰ کہ ممبئی میں کثیر لاگت سے ''کاؤ شٹ کمپنی'' کھولنے کا یقین دلانا امریکہ اور بھارت کے آپسی تعلقات اور غلبہ پراجیکٹ میں ساجھے داری کا عکاس ہے۔ ناول نگار نے کمال مہارت سے مودی کے

مکالموں کے ذریعے اُس کی اور بحیثیت کُل بی۔جے۔پی۔کی اجتماعی نفسیات کی عکاسی کردی ہے۔ ہر سائنسی، عقلی اور منفرد بات کو اپنے مذہب سے ماخوذ بتانا، بات بات پر ''گن پتی بپا موریا'' کے نعرے لگانا اور ہاتھی کی معصومیت پر سوال کرنے کی وجہ سے والنٹیر کو دبے لفظوں قتل کی دھمکی دے ڈالنا، طاقت کی سرشاری اور غلبے کی خواہش کے زیرِ اثر طرزِ عمل کا عمدہ اظہاریہ ہیں۔

طاقت کا وفورمن چاہی سچائی کا متقاضی ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے طاقت ور کئی حربے استعمال کرتا ہے۔ژاں بادریلا کے نزدیک معاصر صورتِ حال میں تشکیلی سچ (Hyper_reality) کے حصول کے لیے سب سے موثر حربہ Simulacra ہے یعنی تصاویر، امیجز کے ذریعے حقیقت سے آگے ایک نئی حقیقت کی تشکیل۔نیرّ مصطفی نے تخلیقی فنکاری کے ساتھ ''ڈھشما'' میں طاقتور کی پیدا کردہ Hyper_reality کا محاکمہ کیا ہے۔مغرب کے سامنے مشرق بالخصوص اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا، ایک تشکیلی حقیقت ہے جس کا زمینی حقائق سے تعلق غیر ضروری ہے۔اس وقت امریکہ ہی طاقت کا دوسرا نام ہے، جو اپنے اہداف کے حوالے سے ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ دنیا کے سامنے حملے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے، دنیا کو تمام محاسن امریکی سربراہ کی ذات میں نظر آتے ہیں اور ہمہ قسم کے مفکرین اسے عیوب سے پاک ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔اب طاقت ور کے سامنے سیاہ کو سفید ثابت کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔تمام مسلم ممالک کو دہشت گردوں کی آماجگاہ اور اور ہاتھیوں کے سامنے خرگوشوں کو دیو ہیکل اور خونخوار ثابت کرنا اس امر کی مثالیں ہیں۔اختلافِ رائے ظاہر کرنے پر والنٹیر کو ٹرمپ کے پستول سے گولی لگنا، پھر اُس کی موت کی وجہ دل کا دورہ ثابت ہونے کے

بعد ایڈورڈ سعید کا جیل جانا ایسی ناممکنات ہیں جو ٹرمپ کے دور میں قرینِ قیاس ممکنات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ سعید اور سیمون کے نظریات کے نتائج کا جنس زدہ عوامل کی صورت ظہور بھی معاصر traped اور absurd صورت حال کا شاخسانہ ہے جو تشکیک، بے سمتی اور لامرکزیت ایسے مظاہر پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

اگر ''ڈھشما'' اکیسویں صدی کی مابعد جدید صورتِ حال پر محیط ناول ہے جس میں معاصر گنجلک سیاسی ،سماجی اور فلسفیانہ افکار ہی کو براہِ راست موضوع بنایا گیا ہے، تو سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اِس میں عام قاری کے لیے کیا ہے؟ کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے تو بظاہر یہ مخصوص اکیڈیمک مزاج لوگوں کے لیے لکھا گیا معلوم ہوتا ہے اور عام قاری کی دلچسپی کا سامان اس میں مفقود نظر آتا ہے۔ اِس نوعیت کے اعتراض کے جواب میں ایک ہی نکتہ کافی ہے کہ ''ڈھشما'' کا اُسلوب۔ ناول کے ادق موضوع کے پیشِ نظر نیر مصطفی نے اردو فکشن کی مروجہ زبان کے تمام دلچسپ سانچوں کو ''ڈھشما'' میں برتا ہے، بہت سے مقامات پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مستعمل پیرایۂ زبان سے ہٹ کر انہیں ایک نیا اسلوب بھی تشکیل دینا پڑا، جو ناول کی فکری وسعت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تحیّر اور دلکشی کا سامان بھی ساتھ رکھتا ہے۔ایک طرف مغرب سے متعلق کرداروں کے منہ سے اُردو کلاسیکی شاعری کے ضرب المثل مصرعے اور کثیر المعانی محاورے متن کو پُرکشش بناتے ہیں تو دوسری طرف معاصر مروجہ سلینگ کا برمحل تخلیقی استعمال متن کی قرأت کو رواں کرتا ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ ''ڈھشما'' کا موضوع کسی نقطے پر قاری کا دامن پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہے تو اُسلوب بازو تھام کر اپنے ساتھ چلنے بلکہ دوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اِس امر

سے نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے قاری جہاں ہر ایک جزو سے لطف لیتا ہے وہیں وہ ''ڈھشما'' کو بحیثیت کُل دیکھنے اور تفہیم کرنے کے قابل ہو پاتا ہے۔

متنوع موضوع اور متاثر کن اسلوب کا حامل ''ڈھشما'' جہاں اپنے مصنف کے خلاق ذہن کا ثبوت ہے وہیں اس کے بین المتونیت کے حامل متن میں وہ تمام خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ اپنی قرأت، تفہیم اور برقراریت کے حوالے سے اپنے خالق کا محتاج نہیں رہے گا۔ ''ڈھشما'' اپنی فکر اور فن کے حوالے سے کئی نئے مباحث کا آغاز کرے گا وراس کا متن ہر تعبیر و تشریح کو جواز بھی فراہم کرتا جائے گا۔ ان تمام عناصر کی بنیاد پر قوی امکان ہے کہ آنے والے دنوں میں ''ڈھشما'' کا شمار اُردو کے چند اہم اور منفرد ناولوں میں ہوگا۔

راشد سعیدی

(بہاول پور)

فروری، دو ہزار بیس

فلسفوں کا تصادم

مجسمہ آزادی کے بالمقابل ایک کشادہ مگر انڈر گراؤنڈ سینما ہال واقع ہے جہاں اب سے کچھ ہی دیر بعد، خطیر رقم سے تیار کی گئی اینی میٹڈ فلم ''ڈھشما'' کا اِنٹی لیکچوئل پریمیئر شو منعقد ہوگا، جس کا مرکزی خیال سیموئیل ہنٹینگٹن کی شہرۂ آفاق کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' سے ماخوذ ہے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق گوتم بدھ اور انتونیو گرامچی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے جمائیاں لے رہے ہیں۔ ایڈورڈ سعید لیپ ٹاپ گود میں رکھ ''کینڈی کرش'' نامی گیم کھیلتے ہوئے، جبکہ سیمون ڈی بوار اپنی فیس بک کمیونٹی ''حکمران عورت'' کا سٹیٹس اپ ڈیٹ چیک کرتے ہوئے، اُن تمام عوامل کو احاطۂ تصور میں لانے کی کوشش کر رہی ہے جو ایک مادرسری نظام کے قیام میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔

اِس دوران ڈونالڈ ٹرمپ اور ایڈولف ہٹلر ریڈ کارپٹ پر موجود ہیں جہاں وہ

پوز بدل بدل کر ہر ممکن اور ناممکن زاویے سے سلفیاں بنارہے ہیں۔ اُن سے کچھ ہی فاصلے پر ایک نفیس سی آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھا والٹیئر ، ہٹلر اور ٹرمپ پر نت نئی جگتوں اور پھبتیوں کے روڑے اور پتھر اچھالتے ہوئے مسلسل بائیں آنکھ میچتا ہے اور فلک شگاف قہقہے لگاتا ہے۔ دونوں حضرات اُس کی ہذیانی، شرمناک اور اخلاق سے عاری گفتگو (اور ہنسی) کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکال دیتے ہیں۔

اِسی اثناء میں نریندر مودی اور رولاں بارتھ سینما ہال کے ساتھ ملحق چھوٹے سے گراسی پلاٹ میں چڑی بلّے کا ایک نہایت سنسنی خیز میچ کھیلتے ہوئے، جبکہ ریفری کے فرائض سیموئیل ہنٹینگٹن سرانجام دے رہا ہے۔

☆☆☆☆

گراچی: (سر کھجاتے ہوئے) پیارے ایڈورڈ! یہ جو تم ویڈیو گیم کھیل رہے ہو، بتاتا چلوں، یہ بھی اُنہی سرمایہ داروں کے سازشی ذہن کا ایک حصہ ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی مرضی کو نہایت مکاری کے ساتھ لوگوں کی مرضی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

سعید: (بدستور گیم کھیلتے ہوئے) کون سے سرمایہ دار بھیا جی؟...... مشرق والے یا مغرب والے؟

گراچی: (آنکھیں سکیڑتے ہوئے) دونوں میں فرق ہی کیا ہے؟...... قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں!

سعید: (بے اختیار مسکرا دیتا ہے) واہ واہ!...... کیا کہنے!...... نہایت خوب صورت اور اُتنا ہی بے محل!

گراچی: (چڑانے کے سے انداز میں) عقل مند کیلئے اشارہ کافی ہے بچے!

سعید: یقیناً!......اگر صحیح سمت میں کیا گیا ہوتو۔

گراچی: (یک لخت بھڑکتے ہوئے) صحیح سمت کی بات مت کرو لڑکے۔تم وہی ہو ناں جس نے اوریئنٹلزم نام کی ایک ڈیڑھ انچی مسجد بنا رکھی ہے جس کے تحت مشرق کے ہر فرد کو مظلومیت اور بے چارگی کا غیر مشروط لائسنس حاصل ہے، چاہے وہ ایک ظالم اور سفاک آمر ہی کیوں نہ ہو۔

سعید: (استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے) برادرِ غیر نسبتی! پہلے تو اِس اَمر کی توضیح کر لیجئے کہ مسجد کا سائز ڈیڑھ انچ نہیں بلکہ دو انچ ہے۔مزید برآں اوریئنٹلزم کو سراہنے کے لئے شکریہ، حالانکہ آپ کا نسلی تعصب اور تہذیبی برتری کا زعم، میری اِن بظاہر حماقت زدہ آنکھوں سے مخفی نہ رہ پایا تھا!

گراچی: (تاسف سے سر ہلاتے ہوئے) دیکھو سعید! اگر تم شک کی گود میں جنم لینے والے چوہے نہ ہوتے تو یہ دنیا ایک بہتر جگہ ہو سکتی تھی۔تمہاری کاہلی اور بے عملی نے آج تک کسی عالمگیر انقلاب کی راہ ہموار نہیں ہونے دی۔ یاد رکھو نہ صرف ہم اُس کے لیے جواب دہ ہیں جو ہم نے کیا ہے، بلکہ اُس کے لیے بھی جواب دہ ہیں جو ہم نے نہیں کیا!

سعید: (ماتھے پر تیوریاں سجائے) میرا سوال محض یہ ہے کہ مجھے خود کو دیکھنے، پہچاننے اور سمجھنے کے لئے تمہاری آنکھیں کیوں مستعار لینی پڑتی ہیں اور آنکھیں بھی وہ، جو اپنی ہی مرضی کا سچ دکھائیں!...... چلو! میں تو مشرق کا ایک فرد تھا، قدم قدم پر قبیلوں، فرقوں اور گروہوں میں بٹا ہوا!......خواہشِ مرگ کے شیرے میں لت پت!...... مفلس، بیمار، تنگ نظر اور ادھورا!......تم تو مگر مائی مغرب کے ایک مکمل آدمی تھے!...... بے تحاشا اور بھرپور!......تم نے کیا کیا؟...... تاریخ کے نام پر مجھے میری کمتری اور کم ظرفی کے قصے سنائے!......

میرے رنگ اور میری زبان کا مذاق اڑایا!...... میری عورتوں کو بدصورت اور غلیظ کہہ کر ان کا دل توڑا!...... میرے خداؤں کی تضحیک کی۔

سیمون ڈی بوار، ایڈورڈ سعید کی گرج دار آواز سے متاثر ہو کر فیس بک کی دنیا سے باہر نکل آتی ہے اور اپنی ٹیبلٹ ایک جانب رکھتے ہوئے اُسے اندر تک ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

سیمون : مسٹر ایڈورڈ! میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں کیونکہ میں ایک غم زدہ عورت ہوں جس نے اپنے شکاری مرد کو خطروں سے بچانے کے لئے زراعت کا فن دریافت کیا اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ زراعت کا فن دریافت ہوتے ہی مجھے ناقص اور کمزور ہونے کا طعنہ دے کر غلام بنالیا گیا۔ آج پانچ ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی فرق محض اِتنا ہے کہ زنجیر کی لمبائی بڑھا دی گئی ہے اور مالک بدل چکے ہیں۔ یہ نئے مالک ذرا مہذب اور چالاک ہیں۔ شبہ تک نہیں ہونے دیتے کہ جس کی نیلامی ہو رہی ہے وہ اصل میں کسی جاپانی گاڑی کا نیا ماڈل ہے یا ہم جیسی ہی کوئی دوسری عورت ہے۔ آپ سے مجھے بس یہی شکوہ ہے کہ جونہی عورت کا ذکر آیا آپ نے فٹافٹ ''میری عورت'' کہہ کر اپنے مالکانہ حقوق مشتہر کر دیئے۔

سعید: (ایک دم شرمندہ ہوتے اور پھر اگلے ہی لمحے ایک شریر سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سموئے) معذرت چاہتا ہوں مادام کہ میرا کوئی جملہ یا لفظ آپ کو آزار دینے کا سبب بنا، لیکن ابھی میں نے آپ کی گفتگو کو ذہن کے پردے پر دہرایا تو یوں لگا جیسے ایک بار آپ نے بھی ''میرا مرد'' یا ''اپنا مرد'' جیسا کوئی لفظ استعمال کیا تھا۔ تاہم ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔

سیمون اور سعید کی باتیں سن کر گوتم بدھ مراقبے سے باہر آتا ہے، آنکھیں کھولتا

ہے، خلا میں دیکھتا ہے اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

گوتم: (سیمون کی طرف دیکھتے ہوئے) یشودھرا؟...... (پھر سعید پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے)...... راہولا؟

گوتم کی آواز اِتنی نحیف و نزار ہے کہ سیمون اور سعید، دونوں ہی یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ بدھ نے اُن کی صورت میں اپنی بیوی اور بیٹے کو ایک لحظے کے لئے سہی، مگر پھر سے مجسم ہوتے دیکھا اور فراموش بھی کر دیا؛ نروان کی مالا مگر اُسی ایک لحظے میں ٹوٹ کر بکھر گئی۔

گراچی: (سیمون اور سعید کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے) نہایت ذی قدر سیمون اور اُتنے ہی ذی وقار سعید!...... لفظ دھوکہ دیتے ہیں لہٰذا ایک ہی جیسے لفظوں کو ملا کر بادشاہ کا بیٹا ایک طرح یہ کہانی تشکیل دے سکتا ہے اور مزدور کی بیٹی ایک ایسی کو جنم دے سکتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ دونوں میری گفتگو کو سمجھنے میں ناکام رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے ہم سب ایک دوسرے کی گفتگو کو سمجھنے میں ناکام رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہر عہد کے لوگ ہر عہد کے لوگوں کی گفتگو کو سمجھنے میں ناکام رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے آج تک کوئی ایک فرد کسی دوسرے فرد کو سمجھ ہی نہ پایا ہو اور جسے ہم ''سمجھنا'' کہتے اور سمجھتے ہوں، وہ اصل میں ''نہ سمجھنا'' ہو! اِس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی!...... یعنی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا!

سعید کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکا دیتا ہے؛ سیمون پلک جھپکائے بغیر گراچی کو دیکھتی رہتی ہے؛ گوتم آنکھیں موندے نروان کی مالا کے ٹوٹے ہوئے منکوں کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔

گرامچی: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں ایک بار پھر واضح کرتا چلوں کہ میں بھی آپ لوگوں کی مانند غلامی کو صفحۂ ہستی سے کھرچ ڈالنا چاہتا ہوں تاہم میں آپ کی طرح قوم، ملک، مذہب، جنس، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیے کی حد بندیوں میں قید ہو کر نہیں سوچتا کیونکہ یہ مشرق اور مغرب یا مرد اور عورت کے بجائے حاکم اور محکوم کی جنگ ہے، جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہتی، المیہ مگر یہ ہوا کہ ٹیکنالوجی پر حاکم کا قبضہ ہو گیا اور محکومی اپنی معلوم تاریخ کے سیاہ ترین دور میں داخل ہو گئی!...... یوں مردانہ وار لڑائی کے بجائے مکر آلود جنگوں نے رواج پایا!...... اور دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے!

سیمون جو کافی دیر سے کچھ کہنے کی منتظر تھی، بالآخر بول پڑتی ہے:

سیمون: موسیو! باقی سب تو ٹھیک ہے مگر لفظ ''مردانہ وار'' اُسی ڈری سہمی اور خوفزدہ مردانگی کا معکوس اظہار ہے جو لفظ ''زنانہ وار'' کو تحقیر اور تنقیص کی علامت میں ڈھال کر بالآخر ایک گالی میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اُسی لمحے گوتم بدھ نے ایک جھٹکے سے نروان کی ٹوٹی ہوئی مالا کے تمام منکے سمیٹ لئے اور کسی ان دیکھے درد کی شدت کو روح کی آخری حد تک پھیلی بوجھل ویرانی میں جذب کر ڈالا۔

گوتم بدھ: میرے عزیزو تمام دکھ ہے!...... یہ صبح دکھ ہے، یہ شام دکھ ہے!

سعید: (گوتم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) لارڈ بدھا! آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر لیکن اندھیرا ہے تو روشنی بھی ہو گی اور نفرت ہے تو محبت بھی ہو گی۔ لہٰذا اگر ''تمام دکھ'' نام کی کوئی چیز سچ میں موجود ہوئی تو ''تمام خوشی'' بھی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہو گی۔

گوتم کچھ سوچتا ہے، پھر اثبات میں سر ہلا دیتا ہے اور اس کے چہرے پر ایک پراسراری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ سیمون اور سعید، نہایت عقیدت اور احترام سے اُسے مسکراتا دیکھتے ہیں اور نظریں جھکا لیتے ہیں۔

بدھ: (چھت کے فانوس پر نظریں گاڑے) دکھ جہاں سے جنم لیتا ہے، وہیں خوشی ہے اور خوشی جہاں سے پھوٹتی ہے، وہیں دکھ ہے اور یہ بھی کون جانے دکھ اور خوشی اصل میں ایک ہی ہوں!...... میرا نروان دکھ میں تھا بالک!...... تم چاہو تو اِسے خوشی میں بھی تلاش کر سکتے ہو!...... جی سکتے ہو!

ڈھز۔ ڈھز۔ ڈھز ـــــــ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ ـــــــ اِسی اثناء میں ایک شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے اور ہاتھ میں پستول پکڑے، سینما ہال میں داخل ہوتا ہے اور ہوائی فائرنگ شروع کر دیتا ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد، ایک دوسرا نقاب پوش کمانڈو نمودار ہوتا ہے اور حاضرین پر پستول تان لیتا ہے۔

گوتم بدھ کے علاوہ باقی تمام افراد خوفزدہ ہو کر ہینڈز اَپ پوزیشن میں چلے جاتے ہیں؛ گوتم بدھ اُسی زاویے میں اور اُتنے ہی اطمینان کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھا رہتا ہے؛ گرامچی اُسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

سعید: (گلا کھنکھارتے ہوئے) بھائی صاحب! اگر آپ مسلم یا ایشیائی دہشت گرد ہیں تو یقین کیجئے میں اُن حالات کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں جن کے تحت آپ کو ایک باوقار مزاحمتی تحریک کا حصہ بننا پڑا۔ بخدا آپ جناب کسی غلط فہمی میں کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لیجئے گا۔ انشاء اللہ میرا شمار دوستوں میں پائیں گے۔

پہلا اسلحہ بردار: (اپنے پستول کا رخ سعید کی طرف کرتے ہوئے) بکواس بند کر مریل ٹٹو! میں پچھلی سات نسلوں سے ''ساؤتھی'' ہوں اور امریکہ جیسے چوں چوں کے مربے میں دو صدیاں گزار چکنے کے باوجود اپنی اساس میں خالص اطالوی ہوں، لہٰذا تم سے کہیں زیادہ امن پسند اور مہذب بھی ہوں۔ واضح کرتا چلوں اگر تم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہل گئے تو میں اِس پستول کی ساری گولیاں تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا۔ مزید واضح کر دوں کہ ایک مریل عربی خچر کو مارتے ہوئے مجھے ذرہ برابر دکھ نہ ہو گا۔

سعید: (باضابطہ کپکپاتے اور منمناتے ہوئے) ڈاکو بھائی! خدا کے لئے گولی مت چلانا، میں پہلے ہی شوگر کا مریض ہوں۔ میری جیب میں بیالیس ڈالر اور اٹھارہ سینٹ ہیں اور کیو موبائل کا سمارٹ فون بھی ہے۔ اِنہیں تم اپنا ہی سمجھو...... بس گولی مت چلانا!

دونوں اسلحہ بردار ایڈورڈ سعید کی گزارشات سن کر قہقہانے لگتے ہیں۔ اِسی اثناء میں ایک بار پھر ہال کا دروازہ کھلتا ہے اور والٹئیر اندر داخل ہوتا ہے، ایک لمحے کو حیرت سے یہ سارا منظر دیکھتا ہے، پھر ماتھا پیٹ لیتا ہے۔

والٹئیر: معذرت چاہتا ہوں دوستو! میں آپ کو اِن اذیت پسند مسخروں سے بچا نہیں سکا۔ وہ لمبے والا ٹرمپ ہے اور چھوٹے والا ہٹلر ہے۔ اِن کو بھی سیموئیل نے پریمیئر پر بلایا ہوا ہے۔ وجہ وہ خود جانتا ہو گا یا میرا خدا جانتا ہو گا۔ آخر الذکر سے پوچھنا تو شاید اتنی جلدی ممکن نہ ہو، اول الذکر سے ضرور پوچھوں گا۔

گرامچی، سعید اور سیمون اُس وقت تک ہاتھ نیچے نہیں کر لیتے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ نہیں جاتے، جب تک ہٹلر اور ٹرمپ اپنے اپنے ڈھاٹے اتار نہیں دیتے۔

ہٹلر: (نہایت ناگواری سے) اے اسفلِ اعظم! اے ارزلِ مطلق! تم وہ واحد غیر

یہودی ہو جس سے میں یہودیوں جتنی ہی نفرت کرتا ہوں! ...... ابھی کچھ دیر اور نہ آتے تو کون سی قیامت آ جاتی؟...... بس ہمیں لارڈ بدھا کا شو دیکھنے کو مل جاتا اور سعید تو دھاڑیں مار مار کر رونے ہی والا تھا۔

سعید: (ذرا کھسیاتے ہوئے) وہ تو بس ذرا میں اَیکٹنگ کر رہا تھا۔ اِدھر تمہاری توجہ ہٹی، اُدھر پستول چھین لیتا۔

گراچی: (سعید کی بات سن کر برا سا منہ بناتے ہوئے) جی بالکل!...... ریکارڈ کی درستی کے لئے بتاتا چلوں، سعید صاحب پچھلے جنم میں ٹارزن اور اُس سے پچھلے جنم میں کنگ کانگ تھے۔

سیمون: (اپنے حواس بحال کرتے ہوئے) اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو!...... اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو!

گوتم بدھ: (ایک عالمِ اثبات میں آنکھیں موندے) تمام دکھ ہے!...... تمام دکھ ہے!

والٹیئر اِس دوران ایک کرسی سنبھال چکا ہے جس پر حسبِ عادت (یا علت) اکڑوں بیٹھا ہے اور اِس نئی صورتحال سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ٹرمپ: (کندھے اُچکاتے ہوئے) صاحبو! حیران میں اِس بات پر ہوں کہ چار دانگ عالم میں آپ کی ذہانت اور فصاحت کے چرچے ہیں اور آپ میں سے کسی ایک کو شک تک نہیں گزرا کہ یہ سب ڈرامہ بھی ہو سکتا ہے، فلم سے پہلے کی ایک فلم بھی تو ہو سکتی ہے! آخر نیویارک کا ایک پوش علاقہ ہے بھائی!...... لائبیریا یا عراق تو نہیں، جو دن دہاڑے ایسی واردات ہو جاتی!

گراچی: (ایک طنزیہ ہنکارا بھرتے ہوئے) یہی تو خطرے کی اصل بات ہے کہ ہم نیو

پارک میں ہیں بھائیو!......اور جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملہ ہو سکتا ہے تو پھر کہیں بھی ہو سکتا ہے!......دنیا غیر محفوظ ہو چکی ہے اور اِس میں سب سے مرکزی کردار تمہاری گورنمنٹ، فوج اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ہے!......شرم تم کو مگر نہیں آتی!

ٹرمپ: اچھا؟......میرا تو خیال تھا اِسکے ذمے دار عربی، ویتنامی، کیوبن، میکسیکن، افغانی، ایرانی اور پاکستانی ہیں!......غلط فہمی دور کرنے کے لئے شکریہ۔

ایڈورڈ سعید: (حلق کی پوری شدت سے) مرگ بر امریکہ!......مرگ بر اسرائیل!

ہٹلر، جو پچھلے کئی گھنٹوں سے ٹرمپ کا بغل بچہ تھا، مرگ بر اسرائیل کا نعرہ سنتے ہی سعید کا ہم نوا بن جاتا ہے؛ دونوں کم از کم دس بار یہ نعرہ لگاتے ہیں، پھر واپس اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

گوتم بدھ: (نظریں جھکائے) موت ہی تو زندگی ہے بالک!......زندگی بھی تو موت ہے!

ٹرمپ خود کو تنہا پا کر سیمون اور والٹیئر کی طرف امداد طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے تو سیمون یوں ظاہر کرتی ہے جیسے اچانک اُس کی بینائی چلی گئی ہو؛ والٹیئر اپنے ہاتھوں کی درمیانی انگلیاں اوپر اٹھا کر ایک عدد فحش اشارہ تیار کرتا ہے تو ٹرمپ احتجاجاً ہال سے واک آؤٹ کر جاتا ہے۔

گوتم بدھ: (اپنا الاپ جاری رکھتا ہے) ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے!......سکوت دکھ ہے، کلام دکھ ہے!

ہٹلر: (کچھ سوچتے ہوئے) احباب! ابھی ابھی لارڈ بدھا کی باتیں سن کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے!

گوتم بدھ کے علاوہ باقی تمام افراد اُس کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔

ہٹلر: (ذرا توقف کرتے ہوئے) آخر وہ کون ہے جو ہم سے ہمارا والہانہ پن، بے ساختگی اور ازلی اچھائی چھین لیتا ہے اور ہمیں ویسا بنا دیتا ہے جیسے ہم ہیں؟ آخر وہ کیا چیز ہے جو ہمیں درد سے کراہتے ہوئے لوگوں کی بے بسی پر ہنسنے کی ترغیب دیتی ہے؟...... زندگی دکھوں کا گھر نہیں ہے بلکہ محبت کی عدم موجودگی اِسے دکھوں کا گھر بناتی ہے!

والٹیئر: (ایکدم نفی میں سر ہلاتے ہوئے) تمہاری یہ ناپختہ اور خام محبت اُس اندھی لڑکی کو کیا دے سکتی ہے، جسے چودھری کا بیٹا اغوا کر کے لے گیا اور تین دنوں کے بعد اُس کی برہنہ لاش کچرے کے ڈھیر پر سے ملی؟......(پھر ذرا توقف کرتے ہوئے)...... میں انصاف کے ساتھ ہوں اور آزادی کے ساتھ ہوں!

گرامچی: محبت بھی اہم ہے مگر میں اپنا ووٹ انصاف اور آزادی کے حق میں استعمال کرنا چاہوں گا!

سعید: اور مساوات کے بارے میں کیا خیال ہے مغرب کے درخشاں ستارو؟......مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ!

سیمون: یہ وہی محبت ہے نا! جس کے نام پر عورت کو جنسی استحصال کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا گیا؟

والٹیئر: اور یہ بھی تو دیکھئے کہہ کون رہا ہے!......ابھی پرسوں کی بات ہے بھیڑیوں کا ایک گروہ گوشت خوری کی مذمت میں پریس کانفرنس کر رہا تھا!...... معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، ایک رپورٹر بکری ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچی۔

ہٹلر: مگر کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ ایک بھیڑیا کسی سیاہ رات کی گھپ خاموشی میں اپنے اندر جھانکتا ہے اور دل کے آئینے میں اپنی مکروہ صورت دیکھنے کے بعد زار و قطار روتا

چلا جاتا ہے!...... جانتے ہو اُس بھیڑیے کا المیہ کیا ہے؟...... وہ جتنا بھی چاہے خود کو بدل لے، جنگل کے باقی جانور اُس کو واپس وہی بھیڑیا بننے پر مجبور کر دیتے ہیں!...... کتنی عجیب بات ہے نا! ولن جتنا بھی پارسا ہو جائے، ہیرو نہیں بن سکتا۔

والٹیئر: شیکسپیئر کا ایک معروف ڈرامہ ہے، مرچنٹ آف داوِینس!...... تم نے یقیناً نہیں پڑھا ہو گا!...... اُسی ڈرامے کی ایک لائن ہے کہ شیطان جب چاہے اپنے مفاد کی خاطر بائبل سے آیتیں پڑھ کر سنا ڈالے!

ہٹلر: شیطان کی مذمت میں لکھے گئے ناول کو پڑھنے سے پہلے یہ تسلی ضرور کر لی جائے کہیں مصنف کا نام خدا تو نہیں!...... پورا سچ اور مکمل اچھائی صرف پادری کے خواب اور پرائمری سکول کی کتاب میں ہوتے ہیں!...... سوال پھر وہی کہ جو جیسا ہے، ہمیشہ ویسا ہی کیوں رہے؟...... ہر نیا دن پہلے جیسا ہی کیوں ہو؟ ...... کتنا مزا آئے رات کا قیدی صبح کو جاگے تو بادشاہ ہو، اور وہی بادشاہ اگلے روز ایک جوکر ہو، اور اُس سے اگلی صبح ایک مالی ہو، اور پھر ایک شیر خوار بچہ ہو، اور پھر ایک کنیز ہو، اور پھر ایک درخت، اور پھر ایک پرندہ، اور ایک جگنو!

گوتم بدھ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور اپنے گلے سے نروان کی مالا اتار کر ہٹلر کی گردن میں ڈال دیتا ہے۔

گوتم بدھ: پچھلے لمحے تم کچھ بھی ہو سکتے تھے، اگلے لمحے تم کچھ بھی ہو سکتے ہو، مگر اِس لمحے تم ایک بدھ ہو!...... آؤ میرے ساتھ!...... مل کر کوئی جنگل تلاش کریں!...... اور اِس بار برگد کے بجائے نیم کی چھاؤں میں نروان ڈھونڈیں گے!...... جو جیسا ہے، ہمیشہ ویسا ہی کیوں رہے؟

سب کچھ جیسے رک سا گیا ہے۔ تمام لوگ اِسی ایک لمحے میں منجمد بیٹھے ہیں۔
اچانک ہٹلر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔

☆☆☆☆

جنون کا ابلاغ

سیموئیل ہنٹینگٹن ایک بیش قیمت سفاری سوٹ میں ملبوس،ڈونالڈ ٹرمپ ، رولاں بارتھ اور نریندر مودی کے ہمراہ سینما ہال میں داخل ہوتا ہے۔ رولاں بارتھ کا منہ بری طرح سے لٹکا ہوا ہے جبکہ مودی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی ہے ،یوں با آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چڑی بلے کا میچ کون جیتا ہوگا۔

ٹرمپ ،جو کچھ دیر پہلے واک آؤٹ کر گیا تھا اب بھی کم و بیش وہی نیم احتجاجی موڈ لئے ہوئے ہے تاہم سیموئیل کبھی اُس کے گالوں تو کبھی بغلوں میں گدگدا کر اُس کا موڈ

درست کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہتا ہے۔

سعید: (کافی گرمجوشی کے ساتھ) چشمِ ما روشن دلِ ماشاد! ......لو جی، آج کی تقریب کے دولہا آ گئے! ...... کہاں رہ گئے تھے بھیا جی! ...... ہم تو آپ کے انتظار میں سوکھ ہی گئے!

والٹیئر: (آنکھوں میں شرارت سموئے) اِس مرحلے پر نہایت ضروری ہوگا کہ آپ کسی بھی اچھی لغت سے لفظ ''انتظار'' کے تمام ممکنہ مفاہیم تلاش کرنے کے بعد اپنے تحت الشعور کے نہاں گوشوں میں چھپی مظلومیت بھری مبالغہ آرائی کو پہچانیں اور کم از کم اپنے فلسفیانہ معروض کو اِس اکتسابی بے چارگی کے شرمناک مظاہرے کی لپیٹ سے محفوظ کر لیں، مبادا آپ کا معصوم اور نیم خواندہ قاری آپ کے فرسودہ نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ آپ کے نفسیاتی عوارض بھی جذب کر لے۔

سعید: (ذرا تنک کر) اگر اختصار کو دانش کی روح سمجھا جائے تو ٹھیک اِسی لمحے آپ ایک بہیمانہ قتل کے مرتکب ہوئے ہیں!

ٹرمپ اور مودی، سعید کا طنز آلود چٹکلہ سن کر قہقہا اٹھتے ہیں تاہم رولاں بارتھ کے ماتھے پر شکنوں کا ایک جال سا بچھ جاتا ہے۔

بارتھ: (اپنے دانتوں سے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن چباتے ہوئے) سوال مگر یہ ہے کیا دیوانگی اور جنون کا ابلاغ ممکن ہے بھی؟ ...... پیغام کنندہ کا شیزوفرینیا یا بارڈر لائن پرسنالٹی ڈس آرڈر، وصول کنندہ میں منتقل ہو بھی سکتا ہے کیا؟ ...... اور یہ بھی کیا پتا جسے ہم دیوانگی کہتے ہوں، وہ اصل میں دیوانگی نہ ہو بلکہ ایک اور طرح کی فرزانگی ہو، کسی اور طرح

کی دانش ہو؟

والٹیئر : (کان کھجاتے ہوئے) اگر ہوش مندی اور فرزانگی کا ابلاغ ممکن ہے تو جنون اور دیوانگی کا ابلاغ بھی ممکن ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو کہیں زیادہ ممکن ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا کے باسی ہیں، جہاں چرکا لگانے کی آرزو مرہم رکھنے کی خواہش سے عظیم تر ہے۔

مودی: (ایک دم سے اُن دونوں کی گفتگو میں آ دھمکتے ہوئے) یہی تو ''ارتھ شاستر'' میں چانکیہ نے کہا تھا اور ''کوک شاستر'' کے مادھیم ہم نے دس ہزار سال پہلے ہی اِن تمام سمسیاؤں کا اُپائے کھوج کر شانتی کو بڑھاوا دیا، جس کا سب سے شکتی شالی پرامن، آپ کے سامنے ورتامان ہے!...... جے گنیش دیوا!...... گنپتی گنپتی!...... گنپتی بپا موریہ!...... موریہ رے موریہ!

ٹرمپ: (تعریفی نگاہوں سے مودی کو دیکھتے ہوئے) گڈ شو بوائے!...... یس انڈیا از گریٹ!...... میری ایک دیرینہ خواہش ہے کہ میں اور مودی مل کر امن اور اسلحے کو خوب فروغ دیں!...... (پھر والٹیئر کی جانب گھورتے ہوئے)...... باقی جو تم چرکا لگانے والی بات کر رہے تھے، میں نے اس پر بہت سوچا ہے، اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک بُل شٹ ہے، اور تم بلڈی فول ہو، اور مزے کی بات سنو، سارے فرانسیسی باسٹرڈ ہوتے ہیں!...... ہاہاہاہاہا!

والٹیئر : (ٹرمپ کی گفتگو اور قہقہے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے) ڈیئر بارتھ! جب گلاب کی ٹہنی سانپ کا پھن دکھائی دینے لگے، خوشبو نتھنوں کو چیر ڈالے، موسیقی کانوں پر تازیانہ بن کر برسے، لمس پتھرا جائیں اور بوسوں سے کراہت آئے تو اُس لمحے آدمی زندگی کو

طلاق دے کر موت کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے،مگر تنہا نہیں بلکہ ایک بہت بڑا مجمع لیے!......لوگوں کا کیا ہے؟......اُن کو تو بس ایک کہانی چاہیے!...... اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا!...... اُس کے پاس بہت ساری کہانیاں ہیں!...... وہ زندگی کے بدصورت چہروں کی کہانی سناتا ہے!...... وہ موت کی حسین آغوش کی کہانی سناتا ہے!...... وہ مرنے سے ذرا پہلے کی کہانی سناتا ہے!......وہ مرنے سے کچھ بعد کی کہانی سناتا ہے!...... وہ نفرت سے پھنکارتے ہوئے دیوتاؤں کی کہانی سناتا ہے!...... وہ اپنے بزرگوں کی عظمت کی کہانی سناتا ہے!...... وہ اپنی عاجزی اور اخلاص کی کہانی سناتا ہے!...... وہ جنگوں اور بربادیوں کی کہانی سناتا ہے!...... وہ خیالی زندگی کا ایک بہت بڑا بت تخلیق کرتا ہے اور اُس بت کی کہانی سناتا ہے!...... وہ گلاب کی ٹہنی اٹھاتا ہے،اُسے سانپ کا پھن کہتا ہے اور سانپ کے پھن کی کہانی سناتا ہے!...... وہ لمس کو کراہت سے جوڑ کر بوسوں کی مذمت میں ہجو لکھتا ہے اور پتھرائے ہوئے جسموں کی کہانی سناتا ہے!...... اور لوگ سنتے چلے جاتے ہیں،اور مرتے چلے جاتے ہیں،اور آخر ایک دن سب مرجاتے ہیں!

گرامچی: (تاسف سے سر ہلاتے ہوئے) اور جو مرنے سے انکار کر دیتا ہے،اُسے باقی سب مل کر مار دیتے ہیں!......خس کم جہاں پاک!

رولاں بارتھ اِس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہتا ہے مگر وقتاً فوقتاً نفی میں سر ہلاتا رہتا ہے،ٹرمپ اور مودی کبھی کاٹ دار نگاہوں سے والٹیئر کا جائزہ لیتے ہیں تو کبھی ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں، ایڈورڈ سعید اپنی کرسی کی پشت کے ساتھ کمر لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا ہے جبکہ سموئیل اضطراب اور بے زاری کی

ملی جلی کیفیت سے دو چار، بار بار گھڑی دیکھتا ہے۔

بارتھ: (والٹیئر اور گرامچی کے خاموش ہوتے ہی) آپ کی گفتگو خالصتاً غیر سائنسی، اور محض قیاس آرائیوں پر مشتمل ہے اور یہی استقرائی فلسفیوں کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے---

ٹرمپ: (رولاں بارتھ کی بات کاٹتے ہوئے) اگر حماقت ایک پہاڑ کی صورت میں نمودار ہوسکتی تو یقیناً تم ایک کوہ ہمالیہ ہوتے!

رولاں بارتھ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ٹرمپ کی طرف دیکھتا ہے، اِس دوران مودی اپنی کرسی سے اٹھ کر والٹیئر کی طرف لپکتا ہے۔

مودی: (ستائشی انداز میں والٹیئر کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی جو آپ نے ایک کویتا سنائی، مجھے تو بہت ہی سندر لگی!...... (پھر جیب سے ایک میڈل نکالتا ہے)...... ایک چھوٹا سا اُپہار آپ کے لئے!...... بھارت رتنا سویکار کریں!...... (میڈل والٹیئر کے گلے میں ڈال دیتا ہے)۔

ٹرمپ سیٹیاں بجاتا ہے؛ رولاں بارتھ غصے سے پہلو بدلتا ہے؛ سیموئیل بے چارگی سے کندھے اچکاتا ہے۔

ٹرمپ: (والٹیئر کی جانب داہنے ہاتھ کا انگوٹھا لہراتے ہوئے) کم از کم میری طرف سے تو بہت مبارکباد!...... میں بھی مودی جی کی طرح آپ کی نثری شاعری سے کافی محظوظ ہوا ہوں اور آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ جس سال ہمیں امن کا نوبل پرائز ملے گا، اُس سال ادب یا طبیعات میں سے کوئی ایک نوبیل، آپ کے لئے ابھی سے مختص کر

دیا گیا!......خاکسار پر یقین نہ ہو تو بھلے رسید لکھوا لیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے!

والٹیئر جونہی میڈل اتارنے کی کوشش کرتا ہے تو اچانک اُس کے ہاتھ اُس کی گردن کو جکڑ لیتے ہیں اور پوری قوت سے نرخرہ دبانا شروع کر دیتے ہیں؛ وہ بہت مشکل سے ہاتھوں کو گردن سے جدا کرتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے میڈل اتارنے کا خیال ترک کر دیتا ہے۔

بارتھ: (خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے) توجنابِ والٹیئر آپ کی نثری نظم!......اف میرے خدایا!......میرا مطلب ہے آپ کی تھیوری میں تجرباتی عنصر کدھر ہے؟......متغیرات کہاں ہیں؟......مقداری تحقیق اپنائی گئی یا کیفی پہلوؤں سے استفادہ ہوا؟......چونکہ ایسا کچھ بھی نہیں لہٰذا یہ بالکل کچرا ہے تاہم ممکن ہے ایسا نہ بھی ہو کیونکہ بہر حال، ہر چیز محض ایک اضافی قدر ہے!......ایک میز، کرسی بھی ہو سکتی ہے اور چیونگ گم بھی، دیکھنا یہ ہے کہ آپ پاتال سے کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہیں یا پیسا ٹاور سے!

بارتھ کے جوشیلے اندازِ بیان کی تاب نہ لاتے ہوئے ایڈورڈ سعید نیند سے بیدار ہو کر جمائیاں لینے لگتا ہے۔

بارتھ: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) لوگ شلجم یا توری نہیں ہیں۔اُن کا ایک وجود ہے۔حسیات کا تنوع ہے۔تجربات کی ورائٹی!......اور پھر انتخاب کا حق؟......آزاد مرضی؟ اِن سب باتوں کی وجہ سے ابلاغ کا عمل اِس حد تک سکڑ جاتا ہے کہ دیوانگی کا ابلاغ تو کجا فرزانگی کا ابلاغ بھی ممکن نہیں!......پھر الوہا کیٹس اور ہرٹا ہیزوگ کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ

میڈیا لوگوں کا استحصال نہیں کرتا بلکہ لوگ میڈیا کا استحصال کرتے ہیں، تاہم میں آپ کی بات سے پورا اختلاف نہیں کروں گا کیونکہ اختلاف اور اتفاق بھی اضافی قدریں ہیں!

سعید: (مضحکہ اڑانے والے انداز میں رولاں بارتھ کی طرف دیکھتے ہوئے) اگر میں ٹھیک اِسی لمحے تمہارے منہ پر ایک طمانچہ رسید کردوں تو تمہارا گال، میرا ہاتھ اور طمانچہ بھی اضافی قدریں ہوں گی کیونکہ اِس طمانچے کا سبب غصہ بھی ہوسکتا ہے اور پیار بھی!......مزید برآں غصہ اور پیار بھی تو اضافی قدریں ہیں۔

گرامچی: (زہر خند لہجے میں) پھر تو رونا اور ہنسنا بھی اضافی ہے!...... بھوکا رکھنا اور بھوک سے مرجانا بھی اضافی ہے!...... اور اگر سب کچھ اضافی ہے تو بارود کے ٹھیکیدار ہی کیوں راج کرتے ہیں؟......امن کے خواب دیکھنے والوں کو سنگھاسن کیوں نہیں ملتا؟

ٹرمپ: (شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے) بڑی آسان سی بات ہے میرے بھائی! امن اور جنگ بھی تو اضافی ہیں۔

سیموئیل: (جو کب سے کچھ بولنے کی آرزو میں تڑپ رہا تھا، بے اختیار بول اٹھتا ہے) کیا بات ہے ٹرمپ صاحب!......دل خوش کردیا!......یہی تو ''تہذیبوں کا تصادم'' اور ''ڈھشما'' کی تقسیم لائن تھی جو کسی وجدانی سطح پر آپ نے پہلے سے ہی ڈی کنسٹرکٹ کرلی!......کیا بات ہے!

ٹرمپ: (جو اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا) تھینک یو مسٹر سیموئیل!...... بچپن میں شمع بینی اور ہپناٹزم کی کچھ مشقیں کی تھیں، بلوغت میں خوب ڈنٹر پیلے اور سر کے بل الٹا کھڑا ہونے کی پریکٹس کی!...... یہ وجدانی قوت ایسے ہی ہاتھ نہیں آگئی!......سو بار عقیق

کٹا، تب نگیں ہوا!

والٹیئر، گرامچی، سیمون اور سعید حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔

گرامچی: خاتون و حضرات! ابھی آپ نے جو منظر دیکھا میڈیا یہی کچھ کرتا ہے اور مسلسل کرتا ہے!...... مسلسل انتشار!...... مسلسل ہیجان!...... ایک بجلی کے جھٹکے کے بعد دوسرا بھی!...... اور اِن دونوں کے بیچ میں ایک عدد کمرشل بریک!...... لہٰذا پاپ کارن کھاؤ، پاپڑ بیلو اور مست ہو جاؤ، کیونکہ رانی تو پپانی!

سیمون: (ایکدم تلملا کر) رانی نہ تو پپا کی ہے اور نہ ہی ہبی کی! رانی بس اپنی ہے اور ہو سکے تو اُسے ایسا ہی رہنے دو۔

سعید: (حقارت سے) کم از کم مشرق میں تو یہ بالکل نہیں ہونے والا!......نو!...... نیور!

بارتھ: (اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) بالکل ٹھیک۔ کیونکہ مشرق سے مغرب ویسا ہرگز دکھائی نہیں دیتا جیسا مغرب سے مشرق دکھائی دیتا ہے اور یہی معاملہ شمال اور جنوب کا بھی ہے مگر معاملات اِس کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں!...... جیسے ایک انڈا محض ایک انڈا نہیں ہے بلکہ ایک پوری مرغی کا امکان بھی ہے اور ڈاروِن کے ارتقائی نظریے کا پہلا سرا بھی!...... انڈا اگر گندا نکل آیا تو اِسے ہائیڈروجن ڈائی سلفائیڈ کا بیش بہا خزانہ سمجھ لیں جو کاربن مونو آکسائیڈ کے ساتھ مل کر ہائیڈروجن بم کی تیاری، اور کائنات کے مکمل خاتمے کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے!...... چنانچہ ایک انڈا اِس کائنات کی ابتداء بھی ہے اور اختتام بھی!...... آؤ اسی خوشی میں ایک نغمہ گائیں، ایک گیت گنگنائیں، تو عرض کیا ہے:

تک دِھنا دِھن تک!......

تک دِھن تک!......

جِن جِن تک!......

رِکن رِکن تک!......

مِن مِن تک!......

بِھن بِھن تک!......

تک دِھنا دِھن تک!......

سعید: (تمسخر بھرے انداز میں رولاں بارتھ کی طرف دیکھتے ہوئے) خیر تو ہے بھیا جی! کوئی بھنگ شنگ تو نہیں پی ہوئی؟...... (پھر ذرا توقف کرتا ہے)...... ہو جاتا ہے! ایسا بھی ہو جاتا ہے!...... (کچھ سوچتا ہے)...... ویسے تم سارے مابعد جدیدیوں کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ اپنے معروض سے کٹ کر سوچتے ہو، چنانچہ اپنی حدود بھول جاتے ہو!......ابھی انڈے کے چھلکے سے نکلے نہیں ہوتے کہ کائنات کی ڈیش میں گھس کر کرتب دکھانا شروع کر دیتے ہو!...... اپنے لوگوں کو دیکھو بھیا جی!...... اپنی دھرتی سے جڑو!

گراچی: (دائیں بائیں سر پٹختے ہوئے) لوگ تو سارے ہی اپنے ہوتے ہیں!

بارتھ: یا پھر کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا، بس ہم ہی ہم ہوتے ہیں!

سیمون: ہم ہیں بھی سہی کیا؟

والٹیئر: (ایک سرد آہ بھرتے ہوئے) یہ ہم کبھی نہیں جان سکتے!

سیموئیل: (کھنکھار کر مداخلت کرتے ہوئے) اِس سے پہلے کہ ہم سب کا وجودی بحران شدید ہو جائے اور ہم باہم دست و گریباں ہو جائیں یا خودکشی اور قتل کے منصوبے بنانے

لگیں، وقت آ گیا ہے کہ میں یہاں آمد پر آپ سب کا شکریہ ادا کروں اور ساتھ ہی اِس امر کی توضیح بھی کر دوں کہ یہ فلم میری نہیں بلکہ آپ سب کی ہے، کیونکہ آپ ہی اِس دنیا کا اصل چہرہ ہیں جس کے وسیلے تہذیبوں کے تصادم کو سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے...... میری ایک ادنیٰ سی خواہش ہے کہ اس فلم کی ڈیڈی کیشن آپ میں سے ہی کسی کے ہاتھوں سرانجام پائے!

گراچی: (اپنی آواز کو ہر ممکن حد تک گھمبیر بناتے ہوئے) لامساوی انسان کے نام!...... جس کا مساوی ہونا ہی اِس دم توڑتی دنیا کے لئے بقاء کا واحد امکان ہے۔

سموئیل: واہ واہ!...... بہت ہی اعلیٰ!...... میں یقیناً اس انتساب کو کوئی بھی دوسری سوچ دیئے بغیر من وعن قبول کر لیتا مگر المیہ یہ ہوا کہ کمیونزم کی مارکیٹ اِس حد تک ڈاؤن ہو چکی کہ روس اور چین بھی اِس کو خرید کر راضی نہیں!

مودی: (نہایت عاجزی بھرے انداز میں) بھارت دھرتی کے اِندر مہاراج کے نام!...... کہ جن کو منو اِتہاس کا پہلا ماہرِ جنسیات ہونے کا سمان حاصل ہے۔

سیمون: (کھلکھلاتے ہوئے) موسیو! اگر تم اِندر کے بجائے دروپدی کا نام لیتے تو بات کچھ بن سکتی تھی!

سیموئیل: (سیمون کی بات کاٹتے ہوئے) چونکہ الفروڈائٹ، ایروس، ڈائنوسس، وینس اور کیوپڈ بھی اِسی صنف میں سپیشلائز کئے ہوئے ہیں لہٰذا گولڈ میڈل کا تعین کرنا اِتنا آسان نہ ہوگا!

مودی زہرخند اور شرربار نگاہوں سے سیموئیل کو گھورتا ہے، کچھ سوچتا ہے، پھر

مسکرا کر پرنام کرتا ہے۔

سیمون: (کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے) اُس عورت کے نام!...... کہ جس کی چھاتیوں سے رِسنے والی دودھ کی دھاروں سے دجلہ، فرات، سندھ، نیل اور ایمزون کی تہذیبوں نے جنم لیا۔

سیموئیل: اگر میں ایک عورت ہوتا تو یقیناً یہ انتساب میرے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر مجھے اندر تک پگھلا دیتا، لیکن افسوس میں ایک مرد ہوں۔

سیمون: (غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے) ایک عورت ہونے کے لئے جتنی گہرائی اور گیرائی درکار ہوتی ہے وہ ویسے بھی تم میں سرے سے مفقود ہے، لہٰذا اگر تم چاہتے بھی تو یہ ممکن نہ ہو پاتا!

ٹرمپ: (ناک سکیڑتے ہوئے) آپ سب لوگ باتوں کے فن میں کافی طاق دکھائی دیتے ہیں چنانچہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میدانِ عمل میں آپ کی حیثیت چند ہارے ہوئے جواریوں سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ جتنا بھی فلسفہ آپ نے پچھلے چند گھنٹوں میں تھر وکیا ہے اِس کا ایک امرود کی پھیری لگانے والے عام آدمی کی زندگی سے کیا تعلق؟ لہٰذا یہ نہ صرف بُل شِٹ ہے بلکہ کاؤشِٹ بھی ہے، جس کا یہاں تو کوئی سکوپ نہیں تاہم یہ شِٹ بزنس، مائی انڈیا میں بلین ڈالر انڈسٹری بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے...... کیوں مودی جی؟

مودی فی الفور چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ طاری کرتا ہے اور ٹرمپ کو دیکھ کر ذرا نیچے جھکتے ہوئے پرنام کرتا ہے۔

بارتھ: (منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے) بیچارے امرود والے کو کیا ملنا ہے؟...... یا شاید کچھ مل بھی جائے؟...... ویسے تو ملنا اور نہ ملنا بھی اضافی قدریں ہیں۔

والٹیئر: (ٹرمپ کی جانب خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) یہ دیکھ کر نہایت خوشگوار حیرت ہوئی کہ آپ امرود کی پھیری لگانے والوں کے بارے میں بھی سوچتے ہیں تاہم یہ سوچ آپ کی پالیسیوں میں بالکل دکھائی نہیں دیتی، جس کی ایک وجہ تو میری پست نگاہی اور تنگ نظری ہو سکتی ہے، لیکن زیادہ امکان اِس کی یکسر عدم موجودگی کا ہے۔

گرامچی: (کسی حد تک ٹرمپ کی بات کی تہہ میں اترنے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ ٹرمپ کا بچہ دراصل عام آدمی کو بیچ میں لا کر اُس احساس کمتری کا مداوا کرنا چاہتا ہے جو حسن اور ذہانت کو یکجا دیکھ کر اِس کے ڈرے سہمے وجود کی غیر محفوظ بنیادوں کو ایک جھٹکے سے گراتی ہوئی باہر نکل آئی ہے!......لو، آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا!

سعید: (ایک دم کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے) تو پھر فرق کیا ہوا ہم میں اور اِن میں؟ یہ کسی اور چیز پر اکڑتے ہیں!...... ہم کسی اور چیز پر پھدکتے ہیں!......تو کیا یہ ساری لڑائی محض اناؤں کی ہے؟......یعنی ذہن کا عضوِ تناسل بڑا ہے یا طاقت کا، اصل مسئلہ بس اِتنا ہی؟

سیمون: (ماتھے پر تیوریاں ڈالے) مسٹر سعید! کوئی بھی انسان اپنے استعاروں کی روشنی میں با آسانی پہچانا جا سکتا ہے، چنانچہ عضوِ تناسل کا استعارہ یقیناً آپ کے نیم قبائلی ذہن میں پنپنے والی جنسی بڑائی کا لاشعوری اظہار ہے۔ تاہم یہ واضح کر دینا نہایت مناسب ہو گا کہ مردانہ عضوِ تناسل نہایت سطحی اور غیر اہم چیز ہے، جس کی مجموعی کارکردگی کو نرم سے نرم

الفاظ میں بھی شرمناک اور مایوس کن کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مودی: (سیمون کی بات بیچ میں سے اُچکتے ہوئے) اگر آپ ہندوستان کی ناگرک ہوتیں تو اِس کٹھور بولی پر آپ کو ستی کر دیا جاتا۔ پرنتو آپ بچ جاتیں تو پھر یہ نشچت ہو جاتا کہ آپ کو دیوی بنا کر آپ کی پوجا ہو۔ ناگالینڈ اور تامل ناڈو کو تو ویسے بھی ایک سفید دیوی کی بڑی آ پکشت ہے...... گنپتی گنپتی!...... گنپتی بپا موریہ!...... موریہ رے موریہ!

سیمون تصور کی آنکھ سے خود کو ایک دیوی کے روپ میں دیکھتی ہے اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احساسِ تفاخر ہلکورے لینے لگتا ہے مگر اِس سے پہلے کہ کوئی اِس بات کا ادراک کر پائے، وہ اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیتی ہے۔

سعید: (اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے) مشرق کے نام!...... جہاں سے ہر روز ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے، جو بالآخر مغرب میں جا کر ڈوب جاتا ہے۔

گرامچی: (ماتھا پیٹتے ہوئے) لو جی!...... پھر سے وہی مظلومیت کی داستانِ ہوش ربا چالو!...... چھیتی بوڑیں وے طبیبا نئیں تے میں مر گئیاں!

بارتھ: (نہایت تیقّن بھرے انداز میں) دیکھیں جی! مشرق اور مغرب محض ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ اب اگر آپ مشرق کا نام بدل کر "بھنڈی" اور مغرب کا نام بدل کر "توری" رکھ دیں تو معاملہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اِسی تناظر میں امن کا ایک ترانہ پیشِ خدمت ہے جو میں نے سونیٹ کی شکل میں تحریر کیا ہے:

مشرق و شرق،

ہارا کاری

مغرب وغرب،

درشن درشن

رات کے اندر!

بات کے اندر!

ذات کے اندر!

اور

سان کے نیچے!

کان کے نیچے!

ران کے نیچے!

بھنڈی بھنڈی توری توری

کیسی قربت، کیسی دوری

اچھا ہے، سب اچھا ہے!

جو بھی ہے سب اچھا ہے!

مودی اور ٹرمپ ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سیموئیل آنکھ کے اشارے سے رولاں بارتھ کو سراہتا ہے۔ سیمون ایک بھرپور انگڑائی لیتی ہے۔ گرامچی سر پیٹ لیتا ہے۔ والٹیئر اتنا ہنستا ہے کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل

آتے ہیں۔ اِس دوران ایڈورڈ سعید سونیٹ کو عروضی حوالوں سے خوب چھان پھٹک کر دیکھتا ہے اور بال آخر اِسے باوزن قرار دے کر بارتھ کے کندھے پر ایک مشفقانہ تھپکی دیتا ہے۔

گرامچی: (رولاں بارتھ کا ٹھٹھا اُڑاتے ہوئے) یعنی تم سچ میں یہ سمجھتے ہو کہ چیزوں کا نام بدل دینے سے اُن کی ماہیت اور کیفیت بھی بدل جاتی ہے؟...... مثلاً اگر تمہارا نام بدل کر ''ڈھکن'' رکھ دیا جائے اور تمہیں کسی آدم خور قبیلے کے حوالے کر دیا جائے تو کیا وہ تمہیں کھانے سے انکار کر دیں گے؟...... بالکل نہیں!...... یقیناوہ تمہیں پوری رغبت سے کھائیں گے، چاہے بعد میں اُن کا نام ''ڈھکن خور'' ہی کیوں نہ پڑ جائے!

والٹیئر: (اپنی شر انگیز ہنسی کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) موسیو بارتھ کی تھیوری تو دلچسپ ہے ہی، مگر اِس کا اطلاق بھی نہایت خاصے کی چیز ہے۔ مثلاً اگر ''بندر'' کا نام ''ٹرمپ'' ہو اور ''کیلے'' کا نام ''ڈِک'' رکھ دیا جائے تو بندر کو بھوک لگتے ہی ٹرمپ کی عزت کا فالودہ ہو جائے گا!

ٹرمپ: (الفاظ کو چبا چبا کر بولتے ہوئے) تم نے بہت غلط آدمی سے پنگا لیا ہے میرے دوست!...... کان کھول کر سن لو کہ میں یعنی ڈونالڈ ٹرمپ، یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کا صدر بنتے ہی اپنے صوابدیدی اختیارات کے ذریعے ''بندر'' کا نام تبدیل کر کے ''والٹیئر'' رکھ دوں گا!...... پھر دیکھتے ہیں کیلا کدھر جائے گا!

والٹیئر: یعنی اگر ڈارون کا نظریہ ارتقاء درست ثابت ہو گیا تو میں تم سمیت دنیا کے ہر انسان کا والد قرار پاؤں گا؟...... کم آن!...... ہاہاہاہاہا۔

ٹرمپ احتجاجاً واک آؤٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے تاہم سیموئیل اُس کے گالوں اور بغلوں میں گدگدا کر اُسے شانت کر لیتا ہے۔

سیموئیل: (والٹیئر کی جانب کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اگر آپ بھی کوئی انتساب تجویز کر دیں تو خاکسار کو دلی مسرت ہو گی!

والٹیئر: (سیموئیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے) کائنات کے نام!...... کہ جس کی بے انت وسعتوں کے روبرو ہماری حیثیت بھلے ریت کے ایک ذرے سے بھی کم سہی، مگر ایک دن ہم اِس کے سارے راز کھوج لینے کے بعد اِس کی تقدیر کے مالک ہوں گے۔

ٹرمپ: (ایکدم شدید طیش میں آتے ہوئے) بکواس بند کر مادر چود کے بچے!...... بکواس بند!...... شٹ اپ، شٹ اپ!

سیموئیل: (انتہائی گھبرائے ہوئے انداز میں) کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟

ٹرمپ: (فرطِ جذبات سے کپکپاتے ہوئے) سنا نہیں؟...... تم نے سنا نہیں؟...... ابھی کچھ دیر پہلے اِس نے؟...... بائبل!...... بلاسفیمی!

سیمون: (ٹرمپ کو دیکھ کر غصے سے دانت پیستے ہوئے) مادر چود؟...... واٹ دا فک؟ اگر تم نے دوبارہ یہ گالی دی تو میں تمہارا مردانچہ اُکھاڑ کر کتوں کو کھلا دوں گی!...... پدر چود کہیں کے!

ٹرمپ: (بیک وقت سٹپٹاتے اور بوکھلاتے ہوئے) مفت کی انٹری مت ڈالو بی بی! گالی ہی دی ہے نا، گولی تو نہیں ماری ہے!...... اور تمہیں تو بالکل نہیں دی ہے، اور تمہیں تو بالکل نہیں ماری ہے!

سیموئیل: (اپنے بالوں کو انگلیوں میں جکڑتے اور بار بار ماتھا پیٹتے ہوئے) اوہو!......رکو! ......رکیں!......رک جائیں!......رکیں تو سہی!......میڈم!......سر!......مسٹر ٹرمپ!......غلط فہمی ہے!......سب غلط فہمی ہے!......پانی پئیں!...... شاباش!......اور میڈم!...... میڈ موزیل!...... جانے دیں!......تھوک دیں!......تھوک دیں غصہ!......تھوکریں!......یہ آپ نے ٹھیک سے تھو نہیں کی!......پورے والی تھو کریں!......یس!......گڈ!......ویری گڈ!

حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ایڈورڈ سعید کرسی کے نیچے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے، رولاں بارتھ اپنا امن کا ترانہ گنگنانے لگتا ہے، نریندر مودی گائتری منتر کا وِرد کرتا چلا جاتا ہے، والٹیئر پلک جھپکائے بغیر ٹرمپ کو دیکھتا رہتا ہے؛ سیموئیل کے بار بار مجبور کرنے پر سیمون، بالآخر زمین پر تھوک دیتی ہے؛ بدقسمتی سے ایڈورڈ سعید اِس تھوک کی زد میں آ جاتا ہے اور ٹھیٹھ عربی زبان میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتا ہے تو رولاں بارتھ اِسے ایک پوسٹ ماڈرن دھن سمجھ کر ناگن ڈانس شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کا چشمہ اُڑتا ہوا گرا پجی کے قدموں میں جا گرتا ہے، جو اِسے چوہا سمجھ کر ایک زوردار چیخ مارتا ہے تو اچانک بھگدڑ مچ جاتی ہے اور سب لوگ بوکھلا کر کچھ نہ کچھ بولنا شروع کر دیتے ہیں:

ٹرمپ: کِل ہم!......کِل ہم!......مادر چود کا بچہ!

سیمون: پدر چود!......پدر چود!......پدر چود کہیں کا!

بارتھ: سان کے نیچے! کان کے نیچے! ران کے نیچے!

گراہچی: باہر نکالو، باہر نکالو!...... چوہا چوہا چوہا!

سیموئیل: غلط فہمی ہے!......سب غلط فہمی ہے!

والٹیئر: ہاہاہاہاہا!......اُف!......ہاہاہاہاہاہا!

سعید: الصباق فی القدمی کُس کُس کُس!

مودی: گنپتی گنپتی!...... گنپتی بپا موریہ!

کچھ دیر تک ایک عجیب بے ہنگم سی صورتحال پیش نظر رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اُن سب کی ہیجانی آوازیں آپس میں مدغم ہوتی چلی جاتی ہیں۔

☆☆☆☆

ہٹلر بدھا نازی نروان

گوتم بدھ اور ایڈولف ہٹلر رات گئے تک کبھی نیویارک کی سڑکوں، تو کبھی رہائشی کالونیوں میں خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے نیم کا درخت تلاش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے اُنہیں نیم کا درخت تو نہیں ملتا، تاہم نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ایک گشتی دستہ ضرور مل جاتا ہے، جو اُنہیں مشکوک سمجھ کر دھر لیتا ہے اور سیر حاصل تفتیش کے بعد آوارہ گردی اور بدچلنی کی دفعات لگا کر حوالات میں بند کر دیتا ہے۔

دس بائی دس کی بیرک ایک سرد جہنم کا سا منظر پیش کرتی ہے جہاں ہٹلر اور بدھ یوگا کے کنول آسن میں بیٹھے زندگی کی بے ثباتی اور سردی کی شدت کے بارے میں کافی غور وخوض کرتے ہیں۔

ہٹلر: لارڈ بدھا! میں نے بچپن میں مرغیاں چرائی، جوانی میں بلوے کئے اور ادھیڑ

عمری میں یہودیوں کی کھالوں کے جوتے بنوا کر پہنے مگر ایک بار بھی قانون کی گرفت میں نہیں آیا!...... اور آج جب میں مکتی کی تلاش اور نروان کی جستجو میں اپنے گھناؤنے وجود کی بدبودار کینچلی اتار کر باہر نکلا ہوں تو مجھے بغیر کسی جرم کے گرفتار کر لیا گیا!...... میرا جی چاہتا ہے اِس ڈیوائن کامیڈی پر خوب بڑے بڑے قہقہے لگاؤں مگر آپ کی عزت و تکریم آڑے آجاتی ہے۔

بدھ: (کنول آسن کو توڑ کر ڈالفن مچھلی کا پوز بناتے ہوئے) ہنسو بالک!...... کھل کے ہنسو!...... جب تم ہنستے ہو تو فطرت کی دیوی بھی تمہارے ساتھ مل کر خوب ہنستی ہے۔

ہٹلر: (بدھا کے نئے آسن کی مضحکہ خیز پیروی کرتے ہوئے) اور جب ہم روتے ہیں، تب کیا ہوتا ہے؟

بدھ: تب بس ہم ہی ہوتے ہیں!...... رونا سب کو اکیلے ہوتا ہے۔

ہٹلر: پیرو مرشد! غم پر قابو پانے کا طریقہ کیا ہے؟

بدھ: زندگی کو دور سے دیکھو!

ہٹلر: کتنی دور سے؟

بدھ: کبھی اِنچی ٹیپ سے ماپ کر تو نہیں دیکھا!...... لیکن کم از کم سو میٹر تو ضرور ہو۔

ہٹلر: اگر آپ اجازت دیں تو میں اِنچی ٹیپ استعمال کر لوں؟

بدھ: اجازت ہمیشہ اپنے آپ سے مانگنی چاہیے!...... بزرگوں سے محض آشیرواد مانگو۔

ہٹلر: نروان کہاں ملتا ہے گرو؟

بدھ: ہر جگہ!...... بس تمہاری طلب سچی ہو۔

ہٹلر: تو کیا دس بائی دس کی اس بیرک میں بھی؟

بدھ: نروان کا کیا ہے بچے جمہورے!...... ملنا ہوتو پھانسی گھاٹ کے تختے پر بھی مل جائے اور نہ ملنا ہوتو مل کر بھی نہ ملے۔

ہٹلر: (ایک دم چونکتے ہوئے) ابھی آپ نے مجھے بچہ جمہورا کہا مرشدی؟

بدھ: (تھوڑا بوکھلاتے ہوئے) میں تو محض بچہ کہنا چاہ رہا تھا!......پھر پتا نہیں کیا ہوا؟......(پھر ایکدم خود کو سنبھالتے ہوئے)......تمہیں برا لگا کیا؟

ہٹلر: برا تو نہیں!......مگر عجیب لگا۔

بدھ: ابھی تمہاری ''میں'' زندہ ہے بالک!

ہٹلر: (تھوڑا پریشان ہوتے ہوئے) اور اِس ''میں'' کو مارنے کا کیا طریقہ ہے لارڈ بدھا؟

بدھ: خودکشی!......

ہٹلر: (مزید پریشان ہوتے ہوئے) یہ تو بہت مشکل ہے آقا!

بدھ: آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا مورکھ!

ہٹلر: (لجاجت بھرے انداز میں) خودکشی کی تاب نہیں مرشد!......کچھ اور عطا ہو۔

بدھ: تو پھر ''میں'' کو لکڑی کے ایک تابوت میں ڈال کر اپنے گھر کے صحن میں دفن کر دو۔

ہٹلر: اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

بدھ: تو اُس کو مار ڈالو!

ہٹلر: (ٹھٹھکتے ہوئے) وہ کیوں؟

بدھ: رازداری نروان کی پہلی شرط ہے بالک!

ہٹلر: (ایک دم شدید کنفیوژ ہوتے ہوئے) تو اِس مارنے اور اُس مارنے میں فرق کیا ہوا لارڈ بدھا؟

بدھ: (خلاء میں موجود کسی ایک نقطے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرتے ہوئے) فرق محض ''اِس'' میں اور ''اُس'' میں ہے۔ مارنے کو دونوں کا نقطۂ اشتراک سمجھ لو۔

ہٹلر: نہیں!...... میں دراصل ''ہولوکاسٹ مرڈر'' اور ''نروان مرڈر'' کے بیچ کا فرق جاننا چاہ رہا ہوں۔

بدھ: (تھوڑا جھنجھلاتے ہوئے) ابے کہا تو ہے فرق محض ہولوکاسٹ اور نروان کا ہے۔ اِن دونوں کو بریکٹ میں لے کر، مرڈر کو مشترک لے لو تو بالکل ٹھیک جواب نکل آئے گا۔

ہٹلر: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) اِتنی ریاضی تو مجھے بھی آتی ہے لارڈ بدھا! میٹرک میں پورے اٹھانوے نمبر تھے۔

بدھ: (طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے) بس اِتنے ہی؟...... میرے تو سو میں سے سو تھے!...... گندھارا بورڈ میں دوسری پوزیشن آئی تھی!

ہٹلر: (مایوس ہو کر اپنا سر پیٹتے ہوئے) اوہو!...... مگر ہم نے تو بس ''میں'' مارنی تھی نا!...... آدمی تو نہیں مارنا تھا!

بدھ: (ذرا درشتی سے) تو کون مر گیا؟...... (پھر کچھ توقف کرتے ہوئے)...... ابھی تو تمہاری ''میں'' بھی نہیں مری۔

گوتم بدھ، ڈولفن مچھلی آسن توڑ کر بالکل سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور گہری گہری سانسیں لینے لگتا ہے۔

ہٹلر: رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے بالاتر ہو کر انسانوں سے محبت کرنے کا کیا گر

ہے لارڈ بدھا؟

گوتم بدھ کے چہرے پر ایک دراڑ سی نمودار ہوتی ہے، جیسے ہٹلر کا سوال سن کر اُس کے اندر کچھ تڑخ سا گیا ہو۔

بدھ: (مضطرب ہو کر) تخلیہ!

ہٹلر: (حیرانی سے کندھے اچکاتے ہوئے) تخلیہ؟ ...... مگر کیوں؟...... ابھی تو بہت سوال باقی تھے۔

بدھ: (شعوری کوشش سے اپنے اضطراب کو کم کرتے ہوئے) کچھ سوال کل کے لئے بھی چھوڑ دے بالک!

ہٹلر: (مزید حیران ہوتے ہوئے) زندگی نہ آنے والے کل میں ہوتی ہے، نہ بیتے ہوئے کل میں ہوتی ہے، زندگی تو بس اِسی ایک پل میں ہوتی ہے!...... آپ ہی نے تو کہا تھا لارڈ بدھا!...... مگر شاید!...... ممکن ہے، نہ بھی کہا ہو!

اِسی اثناء میں تالہ کھلنے کی آواز آتی ہے اور ایک سیاہ فام ادھیڑ عمر آدمی کو اُن کی بیرک میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

سیاہ فام: (اُن دونوں کی جانب ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے) ہیلو!

ہٹلر: (خوشدلی سے) گڈ مارننگ!

''گڈ مارننگ'' کہتے ہی ہٹلر کو احساس ہوتا ہے کہ اُس نے زمینی حقائق کو پوری طرح سے مدِنظر رکھے بغیر لب کشائی کر ڈالی۔ گوتم بدھ اُسے تنبیہی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور آنکھیں موند لیتا ہے۔

سیاہ فام بردے کی سی تیز نگاہوں سے ہٹلر اور بدھ کا معائنہ کرتا ہے اور جلد ہی کسی

نتیجے پر پہنچ کر ایک معنی خیز ہنکارا بھرتا ہے۔

سیاہ فام: (ہٹلر کی جانب دیکھتے ہوئے) کب سے ہیں یہاں؟

ہٹلر: چند ہی گھنٹے ہوئے ہیں!

سیاہ فام: چہرے مہرے سے تو آپ دونوں ہی کرمنل نہیں لگتے!...... پھر یہاں کیسے؟

ہٹلر: (ایک دم چہرے پر بے پناہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے) کرمنل ہونا اور کرمنل لگنا دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں بالک!...... کبھی ایک نرم خو، بظاہر پروقار اور وجیہہ آدمی کے اندر نہایت سفاک قاتل چھپا ہوسکتا ہے اور کبھی ایک کرخت نقوش والا بدصورت آدمی، جھیل میں ڈوبتے ہوئے بچوں کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا ہے!...... چہروں پر کردار لکھے ہوتے تو لوگ کبھی دھوکہ ہی نہ کھاتے!......(پھر تھوڑا توقف کرتے ہوئے) ......خیر!...... آوارہ گردی کا چارج لگا ہے ہم پر!...... کسی حد تک درست بھی ہے!...... آپ یہاں کس سلسلے میں؟

سیاہ فام: کوئی ڈاکومینٹس کا بتا رہے تھے!......ویزہ!...... ہاں شاید ویزہ ہی کہا تھا!

ہٹلر: (تھوڑا حیران ہوتے ہوئے) تو آپ یہاں کے نہیں ہیں؟

سیاہ فام نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔

ہٹلر: تو پھر؟

سیاہ فام: تو پھر کیا؟

ہٹلر: مطلب کہاں کے ہیں؟

سیاہ فام: (جس کے چہرے پر ادھیڑ عمری کے باوجود ایک خاص طرح کی معصومیت اور ملائمت ہے، کافی پراسرار سے انداز میں مسکراتے ہوئے) بتا تو دوں!...... آپ شاید یقین

نہ کریں!

بدھ: (ایک دم مراقبے سے باہر آتے ہوئے) اِس سے کیا پوچھتے ہو؟...... مجھ سے پوچھو بالک!...... یہ نانہجار ایک ایلیسن ہے!......اور غالباً پلوٹو سے آیا ہے۔

ہٹلر: پلوٹو کو تو نظامِ شمسی سے نکال دیا گیا!

بدھ: (ایکدم شدید طیش میں آتے ہوئے) ہمارے نکالنے یا نہ نکالنے سے کیا ہوتا ہے بچے جمہورے!...... ہم سے زیادہ تو ایک چمگادڑ کی اِڈ جانتی ہے!...... ایک چیونٹی کی جبلت جانتی ہے!......ایک کاکروچ کا اجتماعی لاشعور جانتا ہے!......(پھر کچھ نرم پڑتے ہوئے)...... پلوٹو نظام شمسی میں تھا، ہے، اور ہمیشہ رہے گا!......تھوڑا بدچلن اور ٹھنڈا ہے تو کیا ہوا!...... ہے تو سیارہ ہی!

ہٹلر: (تعظیم کے سے انداز میں جھکتے ہوئے) اِتنی سائنس کہاں سے سیکھی لارڈ بدھا؟

بدھ: (ایک گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے) نروان سب سکھا دیتا ہے بالک!

ہٹلر: تو گویا یہ سیاہ فام آدمی پلوٹو سے آیا ہے، جو ایک سیارہ ہے، اور اب بھی ہمارے نظامِ شمسی کا حصہ ہے!......(پھر سیاہ فام آدمی کی طرف تشکیک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے)...... کیوں ٹھیک ہے نا؟

سیاہ فام، جو اِس ساری گفت وشنید سے کافی محظوظ ہو رہا ہے، بے اختیار قہقہا اُٹھتا ہے۔ سیاہ فام کا قہقہانا جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے اور گوتم بدھ برانگیختہ ہو کر مگر مچھ آسن میں چلا جاتا ہے۔ بدھ کی دیکھا دیکھی، ہٹلر بھی اِس آسن کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے مگر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا اور دھڑام سے نیچے جا گرتا ہے۔ سیاہ فام تیزی سے ہٹلر کی جانب لپکتا ہے اور اُسے زمین سے اٹھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

ہٹلر: (اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے) تھینک یو مسٹر ایلیسن!

سیاہ فام: (ایک شریر سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے) تھینک یو کے لئے شکریہ، مگر میں ایلیسن نہیں ہوں!

ہٹلر: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نروان غلط نہیں ہو سکتا!...... لارڈ بدھا غلط نہیں ہو سکتے!...... میں جانتا ہوں تم ایلیسن ہی ہو!

سیاہ فام: میں مستقبل کا انسان ہوں میرے بھائی!...... اے مین فرام دی فیوچر!...... فیوچر تو سمجھتے ہو نا؟

گوتم بدھ: (اُسی مگرمچھ آسن میں لیٹے لیٹے) بکواس کرتا ہے!...... ہارلم سے آیا ہے!...... کسی راہ گیر کو چاقو گھونپ دیا ہوگا!...... تم بھی ذرا محتاط رہنا!

ہٹلر، گوتم بدھ کا نیا مفروضہ سن کر سٹپٹا جاتا ہے اور دانت کچکچانے لگتا ہے۔ سیاہ فام کے چہرے پر شرارت اور اسرار کے ملاپ سے جنم لیتی ہوئی مسکراہٹ مزید گہری ہو جاتی ہے۔ اگلے ہی لمحے، وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور بیرک کی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا دیتا ہے۔ وہ اِس عمل کو بار بار دہراتا ہے یہاں تک کہ اُس کا ماتھا لہولہان ہو جاتا ہے اور خون کے قطرے اچھل اچھل کر فرش پہ گرنے لگتے ہیں۔ پھر اچانک وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا ہے تو لہو اور چوٹ کا نشان، دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔

بدھ اپنے آسن سے باہر نکل کر حیرت سے منہ پھاڑے یہ سارا منظر دیکھتا ہے اور نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔ ہٹلر کی آنکھوں میں بھی ایک بے یقینی کی سی کیفیت ہے جو آہستہ آہستہ تیقّن کی جانب بڑھ رہی ہے۔ سیاہ فام اپنے بدن کو ایک خاص زاویے سے جھٹکا دیتا ہے تو اُس کے پاؤں زمین کی سطح سے بلند ہو جاتے ہیں۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ہوا میں معلق

رہنے کے بعد وہ آہستگی سے نیچے اتر آتا ہے۔

بدھ: (اپنے تمام حواس کو مجتمع کرتے ہوئے) کون ہو تم؟

سیاہ فام: پہلے ہی بتا چکا!

ہٹلر: سائنٹسٹ ہو؟

سیاہ فام: سائنٹسٹ بھی ہوں!

بدھ: کوئی ٹائم مشین وغیرہ؟

سیاہ فام: ہاں ایسا ہی کچھ!

ہٹلر: کتنا عرصہ؟

سیاہ فام: تمہارے ٹائم فریم میں دیکھیں تو لگ بھگ دو ملین سال!

ایک لمحے کو ہٹلر اور بدھ، دونوں ہی کپکپا کے رہ جاتے ہیں؛ اُن کی ریڑھ کی ہڈیاں سنسنا اٹھتی ہیں؛ بدن کا روئیں روئیں سرسرانے لگتا ہے۔

بدھ: (اپنی آواز کی کپکپاہٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) تو یہاں کیسے؟

سیاہ فام: تعلیمی دورہ!...... پکنک بھی۔

ہٹلر: اور حوالات میں کیسے؟

سیاہ فام: ویزہ جو نہیں تھا۔

بدھ: تو اُڑ کیوں نہیں گئے؟

سیاہ فام: پھر یہاں کیسے آتا؟

یکا یک گھمبیر خاموشی کا ایک طویل وقفہ نمودار ہوتا ہے جس کے دوران ہٹلر اپنی

جگہ سے اٹھ کر بیرک کی عقبی دیوار تک جاتا ہے، پانی کا ایک گلاس پیتا ہے، کچھ دیر وہیں بیٹھ کر خلاؤں میں تکتا ہے، پھر واپس اپنی جگہ پر آ کر لیٹ جاتا ہے۔

ہٹلر: (ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بڑبڑاتے ہوئے) توِاس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے تمام تر پاگل پن کے باوجود ہم بچ گئے!...... یہ ممکن تو نہیں تھا!...... ہم سب پاگل جو ہو گئے تھے!...... اور بارود کے ڈھیر پر بیٹھے تھے!...... اور ہر شخص کے ہاتھوں میں ماچس کی ایک ایک تیلی تھی!...... (پھر ایک دم دیوانہ وار قہقہے لگاتے اور خوشی سے اچھلتے ہوئے)...... ہم بچ گئے!...... ہاہاہا!...... ہم بچ گئے!

سیاہ فام: (ایک دم اپنے چہرے پر دنیا جہان کی کرختگی طاری کرتے ہوئے) وہ بارود کا ڈھیر پھٹ گیا تھا!...... سب لوگ مر گئے تھے!...... دنیا بھی فنا ہو گئی تھی!...... کتنے دکھ کی بات ہے نا، سب لوگ مر گئے تھے!...... معصوم بچے بھی!...... کوئی ایک بھی نہیں بچا تھا!

گوتم بدھ: (دکھ اور حیرت کی ملی جلی کیفیات سے مغلوب ہو کر) کوئی ایک بھی نہیں؟...... تو پھر یہ سب کیسے؟...... اور تم؟...... تو پھر تم کہاں سے آ گئے؟

سیاہ فام: (اپنے لہجے کی درشتی برقرار رکھتے ہوئے) پھر سے وہی سب کچھ!...... دوبارہ سے!

ہٹلر: (کسی ان دیکھے جذبے کی شدت میں بھیگتے ہوئے) تب بھی تو تم ہماری ہی اولاد ہوئے نا؟...... آدم کی اولاد!...... جو ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی!

سیاہ فام آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔

گوتم بدھ: (نیم استہزائیہ انداز میں) تو پھر تم کس کی اولاد ہو میرے بچے؟...... جناب ڈارون کے لنگور کی؟

سیاہ فام: (گوتم بدھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے) وائرس!......ہم وائرس کی اولاد ہیں!

ایک دم گوتم بدھ کے دل میں مستقبل کے انسان کے لئے نفرت کی ایک شدید لہر اٹھتی ہے۔ پھر وہ ہٹلر کی طرف دیکھتا ہے جس کا چہرہ بھی غم و غصے سے بگڑ رہا ہوتا ہے۔ دونوں بیک وقت چلاتے ہیں:

''کِل ہم !......کِل ہم !...... مادر چود کا بچہ!''

☆☆☆☆

گوتم بدھ اور ہٹلر، حوالات سے رہائی کے بعد میکسیکو چلے جاتے ہیں جہاں انہیں بہت تلاش بسیار کے بعد نیم کا ایک درخت تو مل جاتا ہے مگر تمام تر ریاضت کے باوجود نروان نہیں مل پاتا۔ گوتم بدھ اِس روحانی ہزیمت کا سارا ملبہ ہٹلر پر ڈال دیتا ہے جبکہ ہٹلر اِس ساری صورتحال کا ذمہ دار تقدیر کو ٹھہراتا ہے جس کے بعد دونوں آدھے پیسے ملا کر نروان کوچنگ سنٹر کھول لیتے ہیں جو دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتے ہوئے پہلے نروان پبلک سکول اور بعدازاں نروان گروپ آف کالجز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نروان گروپ آف کالجز کا ایک ہونہار جاپانی طالب علم ای ہونڈا تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شفیق اساتذہ اور نروان شدہ دوستوں کی معاونت سے ملٹری اکیڈمی کھول لیتا ہے جس میں تعلیم حاصل کرنے والے نوعمر کیڈٹس کو کتکا بازی، شمشیر زنی، چاند ماری، تائیکوانڈو اور نیوکلیئر فزکس کے ساتھ ساتھ آتما شکتی، کالا جادو، لِنگ پوجا، جن جپھا اور آسن سازی کی تربیت بھی فراہم کی جاتی ہے ــــــ

اُدھر، مستقبل کا انسان، جو رات کو نیویارک کی ایک جیل میں قید تھا، اگلی صبح جاگتا

ہے تو یونائیٹڈ ڈزنی لینڈ کا بادشاہ ہوتا ہے۔اُس کی تاج پوشی کے موقع پر جان ایلٹن اور لیڈی گاگا، اپنی سریلی آوازوں میں ''پیلو پکیاں نے'' گا کر سماں باندھ دیتے ہیں۔ مستقبل کا انسان اگلے کچھ ہی گھنٹوں میں ہر قسم کے نسلی، جنسی اور لسانی تعصب کا خاتمہ کر ڈالتا ہے، تاہم جونہی وہ مذہبی تعصب کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو چھوٹا بھیم، جیان اور حسن بغدادی مل کر ایک گوریلا وار شروع کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں فیلڈ مارشل جنرل مکی ماؤس کو ملک بھر میں ایک جزوی مارشل لاء نافذ کرنا پڑ جاتا ہے، جو کچھ ہی منٹوں بعد عوام کی پرزور فرمائش پر مکمل مارشل لاء میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اِس دوران مستقبل کا انسان حالات کی نزاکت کو پرکھتے ہوئے، جھانسی کی رانی کا شٹل کاک برقعہ پہن کر دبئی فرار ہو جاتا ہے۔

اگلی صبح وہ ایک فرانسیسی جوکر ہوتا ہے، پھر اُس سے اگلی صبح ایک کولمبین مالی، پھر ایک آسٹریلین کنیز، ایک سوڈانی شیر خوار بچہ، اور آخر میں ایک بین الاقوامی جگنو ــــــ جگنو بننے کے بعد وہ روشنی کی رفتار سے اڑتا ہوا، اپنے ٹائم فریم میں واپس چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆

ڈھشما

پردہ اٹھتا ہے۔۔۔

سلور سکرین پر کریڈٹس چل رہے ہیں۔۔۔

ایک جناتی سائز کا مگرمچھ اپنا منہ کھولتا ہے اور ڈوبتے ہوئے سورج کو زندہ نگل جاتا ہے۔۔۔

رَنگ برنگے آتشیں دائرے باہم پیوست ہو کر اولمپک رِنگ بناتے ہیں تو عراقی جھنڈوں میں ملبوس، سینکڑوں باگڑ بلے دوڑتے چلے جاتے ہیں۔۔۔

....

پپو ایک لنگور ہے۔۔۔

پپو ایک فوجی لنگور ہے۔۔۔

پپو ایک سچا امریکی ہے۔۔۔

پپو اپنے ملک سے بہت محبت کرتا ہے---

پپو اِس وقت ٹی وی دیکھ رہا ہے---

پپو مرکری نیوز پر دیکھتا ہے کہ عراقی باگڑ بلے، مس ہوائی کو ایک سبز بوری میں ڈال کر مصری اہراموں میں گھس گئے ہیں اور اُن کے ارادے ضرورت سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں---

....

مس ہوائی ایک بندریا ہے---

مس ہوائی امریکہ کی سب سے حسین بندریا ہے---

مس ہوائی ہونولولو میں رہتی ہے---

مس ہوائی ہپ ہاپ میوزک سنتی ہے---

مس ہوائی کا پسندیدہ لباس بکنی ہے---

مس ہوائی کا فگر 36-24-36 ہے---

....

پپو چونکہ مس ہوائی کا فگر دیکھ چکا ہے لہٰذا وہ بالکل نہیں چاہتا کہ باگڑ بلے اُس کا کوئی ایک بھی بال بیکا کر سکیں۔

پپو دریائے ایمزون کے پانی سے کلّی کرتا ہے، یونیفارم پہنتا ہے اور اپنے سپر سانک راکٹ میں بیٹھ کر تین تک گنتی کرتا ہے تو ٹھیک اُسی وقت، وہ قاہرہ کے مضافات میں موجود سرسوں کے ایک بڑے سے کھیت میں لینڈ کر چکا ہوتا ہے، جہاں سے وہ سیدھا امریکن ایمبیسی کا رخ کرتا ہے۔

....

پپو دیکھتا ہے کہ امریکن ایمبیسی کے بالکل سامنے، ایرانی گدھوں اور یمنی گھوڑوں نے نہایت خوفناک پتھر اٹھائے ہوئے ہیں۔

پپو دیکھتا ہے کہ ایمبیسی کے ساتھ ہی ایک خندق کھدی ہوئی ہے جس میں اسرائیلی فاختاؤں کے انڈے بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ خندق بہت گہری ہے مگر اس کے باوجود بھوکے، ننگے اور بدبودار فلسطینی پلوں کا ایک گروہ اِس میں گھسنے ہی والا ہے۔ یقیناً یہ نامعقول پلے، فاختاؤں کے انڈے چرا کر رشین آملیٹ بنانا چاہتے ہیں۔

....

پپو دیکھتا ہے کہ ایمبیسی کے پیچھے ایک وسیع و عریض ریگستان ہے جس میں اکٹوپس نما درختوں کی بہتات ہے۔ یہ سارے درخت حیوان خور ہیں اور اِن کی بقاء خون کی مسلسل فراہمی سے مشروط ہے۔ اِس ریگستان میں ننھے منے انڈین ہاتھی رہتے ہیں جو بہت کیوٹ اور امن پسند ہیں؛ اِس ریگستان میں دیوہیکل کشمیری خرگوش بھی رہتے ہیں جو نہایت اُگلی اور خون خوار ہیں۔

....

پپو تھوڑی دیر کے لئے مس ہوائی کی ہوش ربا جوانی کو فراموش کرتے ہوئے حیوانیت کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

پپو ہوا میں اڑتے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے فائرنگ کر سکتا ہے لہٰذا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

پپو ہر طرح کے بونے، ہکلے، لنگلے اور موٹے گدھوں اور گھوڑوں کو بھونتا چلا جاتا

ہے۔ دہشت گرد گھوڑے اور گدھے، گولیاں کھانے کے بعد نہایت خوبصورت بریک ڈانس پیش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بیک گراؤنڈ پر ایک امن اور شانتی بھرا نغمہ بجنے لگتا ہے جسے سن کر بیوہ کھوتیاں اور گھوڑیاں، چمگادڑوں جیسی آوازیں نکالتی چلی جاتی ہیں۔

....

پپو، پتھر بردار دہشت گردوں کی خبر لینے کے بعد قحط زدہ بِلوں اور دیوہیکل خرگوشوں کی پنگی بجاتا ہے اور جب وہ پوری طرح سے اپنی شکست تسلیم کر چکے ہوتے ہیں تو اُنہیں حیوان خور درختوں کی نرم چھاؤں میں پٹخ کر مدر نیچر کی بھرپور خدمت کرتا ہے جس کی بدولت غذائی سائیکل برقرار رہتا ہے اور اوزون کا شگاف سکڑ کر مٹر کی ایک پھلی جتنا رہ جاتا ہے۔

....

پپو کی شجاعت اور بہادری کا بے مثل مظاہرہ دیکھنے کی خوشی میں سرشار ننھے منے کیوٹ ہاتھی، کتھک اور بھارت ناٹیم کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف فاختاؤں کے انڈے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر امریکی ترانے کی دھن بجاتے ہیں، یہاں تک کہ ہر انڈے سے ایک عدد فاختہ برآمد ہوتی ہے اور مغرب کی جانب پرواز کر جاتی ہے۔

....

ایک جانب پپو حیوانیت کو بچا رہا ہے تو دوسری جانب مس ہوائی، بوری اور بکی سے باہر نکل کر باگڑ بلوں کو للکار رہی ہے۔

باگڑ بلے شدید جنسی درندے ہیں۔۔۔

باگڑ بلے فور پلے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، تاہم اطمینان کی بات یہ ہے

کہ باگڑ بلے گروپ سیکس کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔۔۔

باگڑ بلے ایک بین الاقوامی گروہ کے کارندے ہیں جس کا سرغنہ ایک نہایت زیرک اور مکار افغانی ریچھ ہے جو اِس لئے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ ابھی چند برس پہلے تک عالمی امن کمیشن کا ایک سرکردہ رہنما تھا تاہم بعدازاں اُس کی بدکردار بیوی، ایک انگلش بھالو کے ساتھ فرار ہوگئی جس کے بعد وہ کیپٹلزم اور ارسٹوکریسی سے منحرف ہو کر یزداں اور اہرمن کا پیروکار بن گیا اور بین الاقوامی خلافتِ مجوسیہ کے خواب دیکھنے لگا۔

افغانی ریچھ شاؤلن ٹمپل کا گریجوایٹ ہے۔۔۔

افغانی ریچھ ڈیزی کٹر بم بنانے کا فارمولا جانتا ہے۔۔۔

افغانی ریچھ کے پاس ایک نیلے رنگ کی شیشی ہے جس میں اُس نے ایسے ہولناک وائرس چھپائے ہوئے ہیں جو پوری حیوانیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔۔۔

....

مس ہوائی جونہی باگڑ بلوں کو للکارتی ہے تو اُس کی آواز مصری اہراموں کی دیواروں سے ٹکرا کر ایک پرشکوہ گونج میں ڈھل جاتی ہے جو نیل کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے پپو کی سماعتوں سے ٹکرا کر اُس کی دھڑکنوں کو بے اعتدال کر دیتی ہے۔

پپو، مس ہوائی کی آواز کے تعاقب میں سرپٹ دوڑتا ہوا طوطخ آمن کے مقبرے میں جا گھستا ہے جہاں باگڑ بلوں نے مس ہوائی کو بندوق کی نوک پر قید رکھا ہوا ہے اور سبھی بہ یک زبان اُسے بیلے رقص کے مظاہرے پر اکسا رہے ہیں۔ مکار افغانی ریچھ نے موقع کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے شکیرا کا معروف گانا ''کولہے جھوٹ نہیں بولتے'' بہ آواز بلند چلایا ہوا ہے۔

مس ہوائی چونکہ ایک مضبوط اعصاب کی بندریا ہے لہٰذا اِس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کٹ کیٹ چاکلیٹوں کا ایک ڈبا اور پانچ ہزار ڈالرز مانگ لیتی ہے، جسے تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد دو تہائی اکثریت سے منظور کر لیا جاتا ہے۔

....

پپو، جو اہرام کے ایک باریک شگاف سے یہ سارا منظر دیکھ رہا ہے، اپنی بے پناہ غیرت پر قابو نہیں رکھ پاتا اور ایک ڈریگن کک سے دیوار کو توڑتا ہوا باگڑ بلوں کے جھنڈ میں جا گرتا ہے جو کسی قسم کا آؤ اور تاؤ دیکھے بغیر، سیدھا اُس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

پپو بہ یک وقت مارشل آرٹس اور آتما شکتی سے استفادہ کرتے ہوئے تمام باگڑ بلوں کو دوزخ رسید کر دیتا ہے۔ پھر پپو کی بے قرار نگاہیں پہلی بار مس ہوائی کی مخمور نگاہوں سے ٹکراتی ہیں جن میں پیامِ الفت اور دعوتِ گناہ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

....

پپو، مس ہوائی کی طرف لپکتا ہے مگر ٹھیک اُسی لمحے افغانی ریچھ دونوں کے بیچ میں دیوارِ چین بن جاتا ہے۔

پپو اور افغانی ریچھ بالکل برابر کا جوڑ ہیں لہٰذا اُن کی لڑائی کافی دیر تک جاری رہتی ہے۔ اِس دوران مس ہوائی ''کولہے جھوٹ نہیں بولتے'' کی دھن پر تھرکتی رہتی ہے تاہم اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اُس نے بالآخر اپنی گمشدہ بکنی ڈھونڈی، اور کسی حد تک پہنی ہوئی بھی ہے۔

....

کن اکھیوں سے مس ہوائی کا رقص دیکھنے اور لڑنے کی ملغوبہ کوشش میں دونوں

فریق ضرورت سے کہیں زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں۔ بال آخر افغانی ریچھ زخموں کی تاب نہ لا کر مرنے ہی والا ہوتا ہے کہ مرنے سے ذرا پہلے اُسے وائرس کی شیشی کا خیال آتا ہے اور وہ نہایت مکاری سے اِس کا ڈھکن کھول دیتا ہے۔

پپو جلدی سے شیشی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اِسے بند کر دیتا ہے مبادا وائرس ہوا میں شامل ہو کر بنی نوع حیوان کو ہلاک کر ڈالیں۔ پپو چونکہ زمانۂ طالب علمی میں ایک سائنسدان بھی رہ چکا ہے لہٰذا وہ بخوبی جانتا ہے کہ اِس وائرس کا واحد توڑ پانی ہے۔

....

پپو، شیشی کے منہ پر سختی سے اپنا ہاتھ جمائے اور بے پناہ رقص کے بعد تھکی ہاری اور سہمی سمٹی مس ہوائی کو اپنی کمر پر بٹھائے، دریائے نیل کی طرف بھاگتا چلا جاتا ہے۔

مصری پولیس اور فوج کے اہلکار اُس کا تعاقب کرتے ہیں مگر وہ اپنی رفتار بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

چونکہ افغانی ریچھ سے لڑائی کے دوران اُس کے ہاتھوں پر بھی زخم آئے تھے لہٰذا وائرس اِنہی زخموں کے ذریعے اُس کی ہتھیلی میں داخل ہو جاتے ہیں اور اُس کا شیشی کے اوپر جما ہوا ہاتھ تیزی سے گلنے سڑنے لگتا ہے۔

ٹھیک اُسی لمحے وہ دریائے نیل میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

....

پپو کے بائیں ہاتھ میں ایک برنولا لگا ہوا ہے اور ہاسپٹل بیڈ کے سرہانے بیٹھی مس ہوائی، اُسے شہوت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

پپو کچھ بولنے کی کوشش کرتا ہے تو مس ہوائی اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر

اُسے بولنے سے منع کر دیتی ہے۔ پھر وہ اُس کے ہونٹوں پر جھکتی چلی جاتی ہے۔

....

ساحل کی گیلی ریت پر پپو کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے، مس ہوائی کچھ سوچ کر رک جاتی ہے، آنکھیں سکیڑتی ہے، ایک یا دو سیکنڈ تک اُسے گھورتی ہے، پھر ایک زوردار قہقہہ لگاتی ہے اور دوبارہ اُس کے ہونٹوں پر جھک جاتی ہے۔ فاختاؤں کا ایک جھنڈ تیزی سے پر پھڑ پھڑاتا ہوا اُن کے پاس سے گزر جاتا ہے؛ ننھے منے ہاتھی سونڈیں ہلا ہلا کر پریمی جوڑے کو آشیرواد دے رہے ہیں۔

....

کریڈٹز کے اختتام پر ایک گوریلا، جس کا چہرہ غیر واضح ہے، بڑے پراسرار سے انداز میں ایک عجیب وغریب مشین کا دروازہ کھولتا ہے اور سرخ رنگ کی ایک شیشی نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ دیوانہ وار ہنستا چلا جاتا ہے۔

....

سنگل آؤٹ میلوڈراما

فلم ختم ہوتے ہی سینما ہال کی لائٹس آن کر دی گئیں۔ ''ڈھشما'' نے اِنٹی لیکچوئل پریمیئر شو کے تمام حاضرین کو بہت متاثر کیا ہے مگر تاثر کی نوعیت ضرورت سے کہیں زیادہ متنوع ہے۔ مثلاً ٹرمپ فخر سے چھاتی پھلائے بیٹھا ہے اور اُس کی بدن بولی کا ہر خفیف سے خفیف اشارہ اُس کی بے پناہ مسرت کا غماز ہے تو مودی بظاہر کسی لوو۔ ہیٹ سچویشن میں مبتلا نظر آتا ہے کیونکہ کبھی اُس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ سا پڑ جاتا ہے تو کبھی ایک دم نرمی سی اُمڈ آتی ہے۔ سیمون پلکیں جھپکائے بغیر سکرین کو گھورتی چلی جا رہی ہے تو والٹیئر اپنے عمومی مزاج کے برعکس کافی سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ سعید، ٹرمپ اور سیموئیل کو گھورتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہا ہے تو گرامچی اپنی انگلیوں کو قلم بنائے، فضاء میں کچھ تحریر کرتے ہوئے۔ رولاں بارتھ کے چہرے پر اضطراب کی ایک مثلث سی کھدی

ہوئی ہے تو سیموئیل کی آنکھیں اطمینان اور بوکھلاہٹ کے ہیوی ڈیوٹی لوڈ کی زد میں آ کر کبھی بجھتی تو کبھی ٹمٹماتی چلی جا رہی ہیں۔

والٹیئر: (سیموئیل کی طرف دیکھتے ہوئے) بچپن میں کوئی ایک لڑکی ہمیں دھتکار دیتی ہے تو پھر ہم کبھی محبت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں اور زندگی بھر اُس پر قائم بھی رہتے ہیں!......افسوس ہم بالشتیے رہ جاتے ہیں!

سیموئیل: (ایک دم چونکتے ہوئے) میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟......آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟......ذرا کھل کر کہیے نا!......فلم میں تو کوئی ایسا سین یا سچوئشن نہیں تھی!......(پھر کچھ سوچتے ہوئے)......اوہو!......کہیں آپ ''پپو'' کو کسی علامتی پیرائے میں تو نہیں دیکھ رہے؟

والٹیئر: (سیموئیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے) وہ ایک چابی والا گھوڑا جسے ہم اپنے بچپن میں خرید نہیں پاتے، ایک سلگتی ہوئی حسرت بن کر ہمارے وجود کا اَنمٹ حصہ بن جاتا ہے اور زندگی بھر اپنے منحوس سائے کے پیچھے دوڑائے رکھتا ہے!

سیموئیل نفرت، بے چارگی اور غصے سے والٹیئر کی جانب دیکھتا ہے جو اپنی آنکھوں میں گہرا تاسف لئے، پہلے سے ہی اُس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ دونوں کی آنکھیں کچھ دیر کے لئے آپس میں ٹکراتی ہیں، پھر سیموئیل ایک دم نظریں چرا لیتا ہے۔

والٹیئر: (ایک پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے) محبت نہ کرنے کی قسم توڑ دینی چاہیے!......چابی والے گھوڑے کو مار دینا چاہیے!

مودی: (تھوڑے سخت لہجے میں والٹیئر کو مخاطب کرتے ہوئے) دھیرج!......گرو مہاراج!......دھیرج!......اتنا انیائے مت کریں!......ہو سکے تو فلم پر بولیں!......فلم مت

بولیں۔

سیموئیل: (کچھ سنبھلتے ہوئے) مودی صاحب، آپ حفظِ مراتب کی فکر بالکل مت کریں! یہ کوئی جاپانی مشاعرہ تو ہو نہیں رہا کہ سب سے سینئر شاعر کو سب سے آخر میں ہی پڑھوائیں گے!...... آپ فلم پر بات کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجئے!...... بلکہ ضرور کیجئے۔

مودی: (تھوڑا نیچے جھک کر پرنام کرتے ہوئے) دھنے واد! آپ نے مجھے یہ پراتشٹھا دے کر میرے مان سمان کو خوب بڑھاوا دیا۔ پہلے تو اِس فلم کو لے کر آپ کو بہت بدھائی دینا چاہوں گا۔ چتر کاری اور ابھینائے تو پورن سوادھان تھے ہی، مگر وِشے اور وِچار بھی غضب کے نکلے!...... نیل ندی اور دریائے ایمزون ایک ہو گئے، پورب اور پچھم کا سنگم دکھایا گیا، پھر امریکی ہپ ہوپ اور بھارتیہ کتھک کا مشرن اور میل تو جیسے اُتم سندر ہو گیا سیموئیل جی!...... واہ!...... بلکہ واہ!

گراچی: (بدستور ہوا میں کچھ لکھتے ہوئے) مودی جی! کیا آپ جانتے ہیں ابھی میں نے کیا لکھا؟

مودی نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔ اسی اثناء میں باقی سب لوگ مودی اور گراچی کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔

گراچی: (لفظوں کو چبا چبا کر بولتے ہوئے) کچھ نہیں!...... کچھ بھی تو نہیں!...... بس نظر کا دھوکہ تھا!...... جیسے یہ فلم!...... اور آپ کی عاجزی!...... اور ہم سب!...... جو مرتے دم تک خاموش رہتے ہیں!...... اور کوئی مدد کے لئے چیختا ہے تو کان بند کر لیتے ہیں!

مودی: (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) پرنتو میں نے تو کسی کو چیختے ہوئے نہیں سنا!

گراچی: (تیز تیز پلکیں جھپکاتے ہوئے) چیخا تھا!...... ابھی ایک خرگوش چیخا تھا!...... تم نے سنا نہیں؟...... ہاتھی کے پیروں میں آ کر مسلا گیا تھا بے چارا!

مودی: (کافی پراسرار انداز میں پہلے دایاں اور پھر بایاں ہاتھ آگے پھیلاتے ہوئے) یہ ہاتھ بھی بڑے غضب کی چیز ہیں گراچی جی!...... جتنے پریم سے پرنام کرتے ہیں، اُتنے ہی پریم سے ہتیا بھی کر سکتے ہیں!...... پھر کریا کرم تو ہو ہی جاتا ہے ناں!...... آپ سے بس اِتنی سی بنتی ہے کہ گنیش مہاراج کے بارے میں کچھ بھی بولتے ہوئے شبدوں کے چناؤ میں احتیاط کریں!...... سمجھ تو آپ گئے ہی ہوں گے؟

گراچی: (ایک ہذیانی قہقہہ لگاتے ہوئے) ہاہاہا!...... سب سمجھ گیا مودی جی!...... سب سمجھ گیا!...... پھر سے وہی تفریق!...... پھر سے وہی تقسیم!...... بھائی جان!...... مہربان!...... قدردان!...... بدھی مان!...... آپ سے ایک آخری سوال!...... دور کہیں ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں صرف چھ لوگ رہتے ہیں!...... اُن کے پاس کچھ بھی نہیں!...... مگر پھر بھی وہ خوش ہیں!...... پھر ایک دن اُس دنیا میں ایک گیانی آتا ہے جس کے پاس ایک بڑی سی پوٹلی ہے!...... کوئی بھی نہیں جانتا اس پوٹلی میں کیا ہے اور سب جاننا بھی چاہتے ہیں۔

گراچی ایک دم خاموش ہو کر دور کہیں خلاؤں میں تکنے لگتا ہے۔

سیمون: پھر کیا ہوا موسیو گراچی؟...... آگے بتایئے نا!

گراچی: (خلاء میں موجود کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے) گیانی کہتا ہے وہ اس پوٹلی کا راز اُن چھ میں سے کسی ایک کو ہی بتا پائے گا کیونکہ اگر سب کو یہ راز بتا دیا تو پھر آسمان سے نوکیلے پتھروں کی بارش ہو گی!...... اب سوال محض یہ ہے کہ گیانی اُن میں سے کس کو

پوٹلی کا راز بتائے گا!...... (پھر ذرا توقف کرتے ہوئے) ......اور کسی کو بتائے گا بھی یا ایویں ہی سسپنس ڈال کر رکھے گا؟

ٹرمپ: میرا خیال ہے اُس پوٹلی میں کچھ ہیرے ہوں گے!......سب آپس میں لڑیں گے!......جس کے پاس زیادہ طاقت ہوئی، راز بھی اُسی کا اور پوٹلی بھی۔

سیمون: اگر اُن چھ لوگوں میں کوئی ایک بھی عورت ہوئی تو گیانی کو پٹانا اُس کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہوگا کیونکہ بوڑھے مرد کافی آسان شکار ہوتے ہیں۔

مودی: پرنتو وہ گیانی ہی کیا جو اپنا گیان یونہی فوکٹ میں بانٹتا پھرے!

سیموئیل: (ایک دم جھنجھلا کر) ہم تو فلم پر بات کر رہے تھے!......یہ گیانی کہاں سے آٹپکا؟

سعید: (عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے) گولی تو بندوق سے نکل چکی بھیا جی! پھر راز بھی تو سبھی جاننا چاہتے ہیں ناں!

بارتھ: (کافی سوچ بچار کے بعد) ایک پوٹلی، ایک پوٹلی بھی ہوسکتی ہے اور خمیری نان کا ایک ٹکڑا بھی۔ اب اگر یہ خمیری نان کا ٹکڑا ہے تو اِسے ادرک کے بغیر تناول نہ کیا جائے ورنہ معدے میں گرانی ہوسکتی ہے، جو بالآخر ایک دائمی قبض میں ڈھل کر انتڑیوں کے کینسر کا سبب بن سکتی ہے---

گراچی: (بارتھ کی بات کاٹتے ہوئے) ہم سبھی ایک عہدِ قبض میں جی رہے ہیں ڈیئر بارتھ!......ہم سب کو جُلاب چاہیے۔

سیمون: وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ جُلاب ملے گا کہاں سے؟

گراچی: (مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے) جب تک یہاں جھنڈے والے ہیں اور ڈنڈے

والے ہیں، تب تک تو بالکل نہیں ملنے والا!

والٹیئر: (جمائی لیتے ہوئے) لگتا ہے فلم کے ساتھ ساتھ گیانی جی کا بھی دھڑن تختہ ہو گیا!

سیموئیل: یہ تو آخر ہونا ہی تھا!...... بکھراؤ کا عمل ایک بار شروع ہو جائے تو پھر اِسے روکا نہیں جا سکتا!...... سمٹاؤ یقیناً انسان کی پہلی ایجاد تھی۔

ٹرمپ: (تائید میں سر ہلاتے ہوئے) یو آر ڈیم رائٹ!...... کبھی کبھی خود کو بڑھانے کے لئے خود کو گھٹانا بھی پڑتا ہے۔

سعید: ہاں، مگر اِتنا بھی نہ گھٹایا جائے کہ زمین پر رینگتے بچھو اور انسان میں فرق ختم جائے!

ٹرمپ، سعید کی بات سن کر بے چینی سے پہلو بدلنے لگتا ہے، باقی سب لوگ کسی گہری سوچ میں گم ہیں، خاموشی کا ایک مختصر وقفہ۔

والٹیئر: (ایک معنی خیز ہنکارا بھرتے ہوئے) میرے بھائیو! میرے دوستو! میرے ساتھیو!...... تو ایک چھوٹی سی دنیا تھی جس میں صرف چھ لوگ رہتے تھے!...... پھر ایک گیانی آیا اور اپنے ساتھ ایک پوٹلی بھی لایا جس میں ایک راز چھپا تھا!...... کہانی کچھ سنی سنی سی لگتی ہے، بس کردار تھوڑے بڑھا دیئے گئے ہیں۔

سعید: (تھوڑا ہکلاتے ہوئے) یعنی گندم کا دانہ؟...... باغِ عدن؟......(پھر یکلخت جوش میں آتے اور چلاتے ہوئے)...... او مائی گاڈ!...... او مائی گاڈ!

گرامچی: (سر پیٹتے ہوئے) غلط جا رہے ہو بھائی!...... بالکل غلط جا رہے ہو!...... جو بھی دیکھنا ہوگا، اسی دنیا میں رہ کر دیکھنا ہوگا، ورنہ دیکھنے اور نہ دیکھنے میں جو ایک باریک سا

فرق ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا!......اور اگر یہ فرق بھی ختم ہو گیا تو پھر سب ختم ہو جائے گا۔

سیمون: (ایکدم بوکھلاتے ہوئے) اور اگر سب ختم ہو گیا تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟

گرایچی: (بائیں آنکھ میچتے ہوئے) تم تو جھنڈے پکڑ کر کہیں نہ کہیں گھس جاؤ گے، مسئلہ تو پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا......

والٹیئر: (سعید، سیمون اور گرایچی کی باتوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے) لو! تو پھر آ گیا جواب!......راز جاننے کی خواہش میں سب ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں گے اور گیانی اکیلا اس چھوٹی سی دنیا پر راج کرے گا۔

سیموئیل: (حیرانی سے) تو کیا کوئی اکیلا ہوتے ہوئے راج بھی کر سکتا ہے؟

ڑمپ: یہ تو نہیں پتا مگر راج کرنے والا ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا ہے!......کیوں مودی جی؟

مودی: (ایک دم جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگتے ہوئے) جے بجرنگ بلی!......توڑ دشمن کی نلی!

گرایچی: (تاسف سے سر ہلاتے ہوئے) کاش تم غلط ہوتے والٹیئر!......مگر سچ یہی ہے کہ جب بھی کوئی گیانی کسی چھوٹی سی دنیا میں آئے گا اور لوگوں کے بیچ میں اپنی بڑی سی پوٹلی رکھ کر اُن کو کسی گیان کا جھانسہ دے گا تو سب کے سب مارے جائیں گے!......آج تک تو یہی ہوتا آیا ہے!......اور شاید آئندہ بھی۔

سیمون: لیکن موسیو گرایچی یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ اُس پوٹلی میں تھا کیا؟

گرایچی: (عجب بے چارگی بھرے انداز میں) کچھ نہیں!...... کچھ بھی تو نہیں!...... پوٹلی تو خالی تھی۔

گراچی کا جواب سن کر سب لوگ احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے ہیں۔

سیموئیل: (موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے) اگر سمٹاؤ کا عمل شروع ہو ہی گیا ہے تو کچھ بات ڈھشما پر بھی ہو جائے!......فدوی ہمہ تن گوش ہے۔

بارتھ: میرا خیال ہے یہ ایک سیدھی سادی کارٹون مووی تھی جس میں مزاح کا عنصر کافی غالب تھا تاہم پھکڑ پن بالکل نہیں تھا جو یقیناً ایک عمدہ بات ہے!...... اِسی طرح، اگر مس ہوائی کی بکنی کا سائز دو تین انچ زیادہ ہو جاتا تو فحاشی کا تناسب بھی کچھ کم ہو سکتا تھا!...... ویسے تو فحاشی اور پاکیزگی بھی اضافی قدریں ہیں مگر فحاشی بہر حال کچھ زیادہ اضافی ہے۔

سعید: (برا سا منہ بنا کر سیموئیل کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ چوسنی بردار دانشور کہاں سے امپورٹ کیا ہے بھائی؟...... مجھے بھی ایسے ایک درجن لے دو!...... اِن سے بچوں کی نظمیں اور پی ایچ ڈی کے تھیسز لکھواؤں گا۔

رولاں بارتھ، سعید کی بات سن کر ڈِپریس ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے ڈِپریشن کو کم کرنے کے لئے سیمون پر ایک ہوس بھری نگاہ ڈالتا ہے تو اگلے ہی لمحے سعید کو بھوکی نگاہوں سے تاڑنے لگتا ہے۔ پھر دوبارہ ڈپریس ہو کر سوچتا ہے کہ اُس نے کس کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھا ہے اور کس کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھنا چاہیے تھا، تاہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہوس بھی ایک اضافی چیز ہے۔

سیمون: (جو کافی دیر سے سیموئیل کی جانب معاندانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے) واضح کرتی چلوں عورت محض ایک جسم نہیں ہے بلکہ ایک جیتا جاگتا وجود بھی ہے۔ تاہم اِس فلم

کے رائٹر، پروڈیوسر اور ڈائریکٹر عورت کو مٹن کے ایک ڈھیر سے زیادہ کچھ بھی سمجھنے پر تیار نہیں، جس پر میں شدید احتجاج کرتی ہوں۔

سیموئیل: (احتجاجاً کندھے اچکاتے ہوئے) یہ آپ کی صریحاً غلط فہمی ہے مادام!...... میں عورت کو مٹن کا ڈھیر ہرگز نہیں سمجھتا!...... میری تو بلکہ ایک مشہور تھیوری ہے جس کے مطابق عورت کا جسم بیف سے مشابہہ ہے۔

سیمون: (نفرت بھرے انداز میں) تمہاری باتوں سے نیکروفیلیا کے بھبکے اٹھتے ہیں! مجھے یقین ہے تم ایک عمدہ گدھ ہو سکتے تھے۔

سیموئیل: (برا منائے بغیر) عرفی تُو میندیش زغوغائے رقیباں!...... آواز سگاں کم نہ کنند رزقِ گدارا۔

ٹرمپ: (کافی خوش گوار لہجے میں) واہ!...... کسی آرین شاعر کا کلام لگتا ہے!...... اب افریقی بوزنے تو ایسا کہنے سے رہے!...... بات پھر ادھوری رہ جائے گی لہٰذا فلم کی طرف واپس آتے ہیں۔

سیموئیل: (ایکدم کھلکھلاتے ہوئے) تھینک یو!...... تھینک یوسر!...... پلیز!...... پلیز!

ٹرمپ: سب سے پہلے تو پپو کی بات ہو جائے!...... پپو ایک بہت بڑا امریکی خواب ہے جو میں حیران ہوں تم لوگوں نے دیکھ کیسے لیا؟...... خیر!...... پپو ایک سچے امریکی کی طرح حیوانیت، میرا مطلب ہے انسانیت سے بہت پیار کرتا ہے!...... مزید برآں وہ مس ہوائی پر بھی فریفتہ ہے، جو اُسے ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ میرا فیورٹ فگر بھی یہی ہے یعنی 36-24-36۔

سیمون: (دانت پیستے ہوئے) میں نے کہیں سنا تھا ہر وہ مرد جس کی اپنی میئر منٹ پانچ انچ سے کچھ کم ہو، اُس کا فیورٹ فگر یہی ہوتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ تھیوری ٹھیک ہے یا غلط، مگر ہے بہت دلچسپ!...... کیوں موسیو!

ٹرمپ: (سیمون کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے) خرگوش کو کمینگی کی ایک بھرپور علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اگر آپ محض ایک لمحے کے لئے خرگوش کے کانوں کا تصور کرلیں تو آپ کو میری بات بہ خوبی سمجھ آ جائے گی۔

بارتھ: (ٹرمپ کی تائید کرتے ہوئے) بالکل ٹھیک مسٹر ٹرمپ!...... میں آپ کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں!...... بلکہ میں نے تو خرگوش کی مذمت میں ایک نثری نظم بھی کہی ہے۔

خرگوش!

گدھے کے کانوں والا!

جس کا بکری جیسا منہ!

اور چھریوں جیسے دانت!

جس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے ہنہنا اٹھے گا۔

اوئے خرگوش!

بتاتا چلوں!

تمہاری آنکھیں بالکل بھینگی ہیں اور تمہارے جسم سے بو بھی آتی ہے۔

لگتا ہے تمہیں نہانا کچھ زیادہ پسند نہیں!

اور میں تم سے نفرت بھی کرتا ہوں بہت ہی شدید والی!

تاہم اگر تم ایک بروسٹ کی شکل میں میرے سامنے آ جاؤ!

تو اِسے میرا پکا والا وعدہ سمجھ لو!

میں تمہیں خوب مزے لے لے کر کھاؤں گا۔

سیموئیل: (حیران ہوتے ہوئے) واہ مسٹر بارتھ!...... اس نظم کا علامتی نظام تو کافی بلیغ ہے۔موضوع بھی نویکلا ہے۔ مسئلہ اِس کی ہیئت میں ہے!...... اگر یہ آزاد نظم ہوتی اور کسی اچھی سی بحر میں ہوتی تو یقین مانو بہت خاصے کی چیز ہوتی۔

بارتھ:) تفکر کے عالم میں پیشانی کھجاتے ہوئے) وہ تو چلیں میں اِسے ری رائٹ کر لوں گا!......مگر بحر کون سی ہو؟

سیموئیل: (تھوڑے غور وخوض کے بعد) میرا خیال ہے بحرِ منجمد جنوبی زیادہ مناسب رہے گی!...... اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جنوب میں خرگوش بکثرت پائے جاتے ہیں!......دوسرا یہ کہ پابلونرودا، یاسر عرفات اور ٹام کروز کی زیادہ نظمیں بھی اِسی بحر میں ہیں!

سیمون اور سعید، ٹرمپ، سیموئیل اور بارتھ کی باہمی گفتگو سے کافی نالاں اور زچ دکھائی دیتے ہیں۔سیمون نے تو ایک بار اپنے کانوں میں ہیڈ فون بھی اڑس لیا تھا مگر جلد ہی اِسے اپنے فراری رویئے پر محمول کرتے ہوئے، واپس اپنے معروض میں لوٹ آئی۔

ٹرمپ: (گفتگو کا سلسلہ واپس فلم سے جوڑتے ہوئے) آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں!......ویسے تو باگڑ بلوں کی کافی عمدہ دھلائی ہوئی مگر ہر کے یالات کے بعد ڈھشما کی آواز آتی تو بات ہی کچھ اور ہوتی!

یہ کہہ کر ٹرمپ منہ سے ڈھشما کی آوازیں نکالتے ہوئے چند ہوائی مکے اور ایک عدد بٹرفلائی کک چلاتا ہے۔ بدقسمتی سے اُس کی بٹرفلائی کک کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہتی جس کے نتیجے میں اُس کی کرسی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا گرتا ہے، تاہم اگلے ہی لمحے وہ پھر سے ڈھشما کی آوازیں نکالتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جس پر اُس کے دوست تَو دوست، دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ٹرمپ: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) دیکھئے جناب!......میرے خیال میں تَو یہ فلم اورینٹ اور آکسی ڈینٹ کے مابین ایک بھرپور مکالمہ ہے جس میں۔۔۔

سعید: (ٹرمپ کی بات بیچ میں سے اُچکتے ہوئے) مکالمہ تَو بھرپور ہے بھیا جی!......مگر ہے یک طرفہ!......لہٰذا ریکارڈ کی درستی کے لئے اِسے خودکلامی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مزید برآں اِس فلم کو مغرب کی فنی اور فکری بددیانتی کا نہایت اعلیٰ اور ایک بے مثل شاہکار بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

سیمون: (اپنی آواز میں دنیا جہان کا دکھ سموئے) فاختہ تَو پاگل تھی!......توپ کے دہانے میں!......گھونسلہ بنا بیٹھی۔

سعید: (واپس کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے) فاختہ تَو پاگل تھی ہی!...... ورنہ مغرب کی جانب پرواز کیوں کرتی؟...... المیہ مگر یہ ہوا کہ کیمرہ مین بھی سنکی نکلا!...... پپو کو ہائی اینگل میں شوٹ کیا گیا تَو باگڑ بلوں اور خرگوشوں کو لو اینگل میں۔

گرامچی: (مشفقانہ لہجے میں) یہ محض پاگل پن نہیں، طبقاتی جنون اور اُس کا ابلاغ بھی ہے!......ہائی اینگل، مطلب حاکم!...... لو اینگل، مطلب محکوم!...... یعنی کیمرہ اوپر سے

آئے گا تو آئیڈیا بھی اوپر سے آئے گا!...... اور جانتے ہو جب کوئی آئیڈیا اوپر سے آتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟...... آڈینس اُس کے بوجھ تلے دب جاتی ہے!...... اور پاتال میں گھس جاتی ہے!...... اور بو دینے لگتی ہے!...... اب جو پتھر ہے آدمی تھا کبھی، پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

والٹیئر : (زہر خند لہجے میں مسکراتے ہوئے) انسان نے دس ہزار سالوں میں جو کچھ تخلیق کیا ہے، ایسی فلمیں محض دو ہی گھنٹوں میں وہ سب کچھ برباد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جو یقیناً ایک قابلِ تحسین بات ہے!

ٹرمپ، والٹیئر کی پوری بات سنے اور سمجھے بغیر تالیاں پیٹنے لگتا ہے۔ سیموئیل اور بارتھ بڑی مشکل سے اُسے تالیاں بجانے سے روکتے ہیں تاہم ٹرمپ اِسے آزادیٔ اظہار میں رخنہ تصور کرتے ہوئے اپنی رانیں اور بغلیں بجانا شروع کر دیتا ہے۔

ٹرمپ: (چہکتے ہوئے) سولہ آنے درست کہا والٹیئر بھائی!...... اور دیکھیے، فلم کا نام کتنا اسمِ بامسمّٰی ہے!...... ''ڈھشما''...... جیسے جہالت اور دہشت گردی کے منہ پر ایک بھاری بھرکم مکہ رسید کر دیا گیا ہو۔

والٹیئر : نہ صرف یہ، بلکہ ''ڈھشما'' محبت، رواداری، امن اور عالمگیر اخوت کے منہ پر بھی ایک شاندار طمانچہ ہے۔

اِس دوران سیموئیل اپنی پینٹ کی جیب سے ایک پولو ہول والی گولی برآمد کرنے کے بعد سیدھا اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے اور مینتھول کے ٹھنڈے ٹھار احساس کو اپنے حلق کے ساتھ ساتھ، اپنے تیزی سے گرم ہوتے دماغ میں بھی انڈیلنے کی کوشش کرتا ہے۔

سیمون: (اپنی تمام تر فلسفیانہ خوکو تھامے) اگر تھیم کی بنیاد پر اِس فلم کا پائزے مقرر کیا جائے تو میں اِسے اوسط سے کچھ کم درجے کی پورن قرار دینا چاہوں گی!...... واضح کرتی چلوں کہ پورن سے مراد صرف ننگا نہیں ہوتا!...... میں گھٹیا اور بے ہودہ کو بھی اِسی کیٹیگری میں رکھتی ہوں۔

سیموئیل آنکھیں موندے، پولو ہول والی گولی کو دائیں بائیں گھماتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے گال بھی دائیں بائیں گھومنے لگتے ہیں، پھر وہ کسی وجدانی خیال کے زیرِ اثر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیتا ہے۔

سیموئیل: (اپنے لہجے میں خوشدلی اور خوشامد کو یکجا کرتے ہوئے) مادام!...... اگر مس ہوائی کو بکنی کے بجائے یونیفارم پہنا دیا جائے اور اس کے پاس راکٹ اور بندوقیں بھی آ جائیں تو کیا ''ڈھشما'' کو کچھ رعایتی نمبر مل پائیں گے؟

سیمون: (ایک دم پگھلتے ہوئے) بالکل!...... اور اگر مس ہوائی کو مکے اور لاتیں چلانے اور دنیا کو بچانے کے یکساں مواقع فراہم کر دیئے جائیں تو میں اے پلس بھی دے سکتی ہوں۔

سیموئیل: (نہایت طمانیت بھرے انداز میں) گڈ!...... اور مسٹر گراچی!...... اگر پپو کو ایک امریکی لنگور کے بجائے ایک اطالوی بکرا دکھایا جائے اور اُس کے دل میں اشتراکیت اور اشتمالیت کے لئے نرم گوشہ بھی موجود ہو!...... تو پھر؟

گراچی: اس کا صحیح فیصلہ تو گوشے کی نرمی کو دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔

ٹرمپ: (ایک دم کچھ یاد کرتے ہوئے) ہیلو ہیلو!...... او، ہاں یاد آیا ''چوہا چشمہ مادر

چودبلاسفیمی کرائسس‘‘ کی وجہ سے میری ڈیڈی کیشن تو رہ ہی گئی تھی......(پھر بڑے دلار سے)......اب میں بولوں کہ نہ بولوں؟

سیموئیل: (اُس کی بلائیں لیتے ہوئے) بولو!...... بولو!

بارتھ: نونو!......نونو!......آئی آبجیکٹ می لارڈ!......یہ تو سراسر بے ضابطگی ہوئی!...... ڈیڈی کیشن کا ٹائم تو کب کا ختم ہو چکا۔

مودی: میں نے ایک بار اپنے لئے دس نیم بنائے تھے۔پہلا نیم تھا کہ کبھی بھی اپنے نیموں کا اُلنگھن مت کرو اور دسواں نیم تھا کہ جہاں کوئی بڑا فائدہ دِکھ رہا ہو، وہاں تھوڑی دیر کے لئے پہلے نیم کا اُلنگھن کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

والٹیئر: (مودی کی جانب ایک توصیفی نگاہ اُچھالتے ہوئے) تم یقیناً اُس سے کہیں کم بے وقوف ہو، جتنے پہلی بار میں دکھائی دیئے تھے!

مودی: (نہایت عاجزی کے ساتھ) اوم!...... اوم!......سب بھگوان کی کرپا ہے والٹیئر جی!...... پرنتو آپ ذرا دھیرج رکھیے کہ دھیرج رکھنے میں ہی سکھ چھپا ہے!...... ورنہ لارڈ بدھا تو پہلے ہی کہہ چکے، ’’تمام دکھ ہے، تمام دکھ ہے!‘‘ ......یعنی پھر سے دھیرج!...... اور بھارت رتنا بھی تو ہے!...... اوم!...... اوم!

والٹیئر: (ایک دم ہکلاتے ہوئے) وہ تو میں!...... میں تو بس!

مودی: (ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ) جے بجرنگ بلی!......توڑ دشمن کی نلی!...... گنپتی گنپتی!......گنپتی بپا موریہ!......موریہ رے موریہ!

ٹرمپ: (خجالت سے سر کھجاتے ہوئے) لو جی!...... پھر سے چالو!......(پھر ایک سرد آہ

بھرتے ہوئے)......غریب کی پگڑی ہی ہے نا!......جتنی چاہے اچھال لیجئے!

سیموئیل: ارشاد۔ارشاد!

ٹرمپ: غریب کی پگڑی ہی ہے نا!......جتنی چاہے اچھال لیجئے!

سیموئیل: یہ نہیں مسٹر ٹرمپ!...... میں ڈیڈی کیشن کے ارشاد کی بات کر رہا تھا۔

ٹرمپ: (مشکوک نگاہوں سے) کیوں؟...... یہ اچھا نہیں تھا!

سیموئیل: (روہانسا ہوتے ہوئے) یہ بھی اچھا ہے سر!......مگر میرا خیال ہے ڈیڈی کیشن اِس سے کہیں زیادہ اچھی ہوگی۔

ٹرمپ: (دل ہی دل میں باغ باغ ہوتے ہوئے) تو ارشاد کیا ہے!...... اُس پائیدار، بڑھیا اور سستی امریکی بندوق کے نام، جس کا حصول دنیا کے ہر فرد کا لازمی حق ہے تاکہ وہ دشمنوں کے ساتھ ساتھ، دوستوں سے بھی خود کو محفوظ رکھ سکے!

سیموئیل: (جس کے لہجے میں ایک دم بہت سا احترام گھل جاتا ہے) نہایت محترم ڈونالڈ ٹرمپ!......آپ نے تو کمال ہی کر دیا!......یعنی ایک ہی سطر میں آپ نے اپنا ثقافتی شعور، بنیادی انسانی حقوق کا ادراک، زمینی حقائق کی تفہیم اور جذبہ حُب الوطنی عیاں کر ڈالا!...... کیا بات ہے!......خاکسار کو اجازت دیں کہ وہ اِس انتساب کو فی الفور اپنی فلم کا ایک انمٹ حصہ بنا ڈالے۔

ٹرمپ: (اپنی آواز کو ہر ممکن حد تک پروقار بناتے ہوئے) ہاں!......ہاں!...... ضرور!......ضرور!

سعید: (جس کے حلق میں ایک دم کڑواہٹ سی بھر جاتی ہے) غریب کی پگڑی ہی ہے

نا!......جتنی چاہے اچھال لیجئے!

ٹرمپ: (تھوڑا حیران اور زیادہ مسرور ہوتے ہوئے) لو، جی!...... میرا شعر تو لگتا ہے کافی پاپولر ہو گیا!

سعید: کوئی ایسا ویسا!...... محض اِسی ایک شعر میں اُس آدمی کا اصل چہرہ دیکھا جا سکتا ہے جو فاختہ کے انڈوں کو بچانے کے لئے، بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کا نرخرہ کاٹ ڈالے!

سیموئیل ایک دم اپنا چہرہ چھپالیتا ہے، پھر وہ اپنی ہتھیلیوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کنکھیوں سے مودی اور ٹرمپ کی جانب دیکھتا ہے اور اُن کو نارمل بی ہیو کرتے دیکھ کر خود بھی نارمل ہو جاتا ہے۔

سعید: (اپنی آواز کی پچ بڑھاتے ہوئے) تم جو روشنی کی شان میں قصیدے لکھتے ہو اور اُبھرتے ہوئے سورج کی آنکھیں نوچ لیتے ہو!......تم جو آزادی کے حق میں بڑے بڑے بینر آویزاں کرتے ہو اور اُڑتے ہوئے پنچھیوں کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی قید کر لیتے ہو!......تم جو لفظوں کے بطن سے معنی کشید کرتے ہو اور معنی کے رس میں جھوٹ کی شیشیاں اُنڈیل دیتے ہو!...... سچ کہوں تو محض اِسی ایک شعر میں!

بارتھ: (جو اچانک کسی ہیجانی کیفیت کے نرغے میں جا پھنستا ہے) میں آزاد ہوں! ......معنی آزاد ہیں!......روشنی بھی تو آزاد ہے!......سب اچھا ہے، سب اچھا ہے!

والٹیئر: مگر روشنی تو قید ہو چکی!

بارتھ: کب؟

والنٹیر: (کوئی بھولی بسری کہانی یاد کرتے ہوئے) جب مگر مچھ نے اپنا بڑا سا منہ کھولا تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کو زندہ نگل گیا تھا، تب روشنی بھی تو قید ہو گئی تھی۔

بارتھ: (ایک دم خوف سے لرزتے ہوئے) پھر تو سب غلط ہو گیا!...... بالکل غلط ہو گیا!...... (پھر کچھ سوچتے ہوئے)...... مگر ٹھیک تو کرنا ہی ہوگا!

سیمون: (سوالیہ انداز میں بارتھ کی جانب دیکھتے ہوئے) ٹھیک کیسے ہوگا؟...... اِس کے لئے تو پہلے یہ جاننا ہوگا کہ ہم ہیں کون؟...... (پھر ایک شکست خوردہ لہجے میں)...... اور یہ ہم کبھی نہیں جان پائیں گے۔

سعید: (ایک دم کسی شانت جھیل کی مانند) مگر میں جانتا ہوں!...... میں افریقہ ہوں، میں ہی باگڑبلا ہوں، اور ڈوبتا ہوا سورج بھی!...... میں نے کہا تھا نا گراچی، میں سب جانتا ہوں!

گراچی: میں بھی تو یہی کچھ ہوں!...... ہم سب ایک ہی تو ہیں!...... آ جاؤ افریقہ!...... آ ؤ ببر کی چال!

ٹرمپ: (عجیب پھٹی پھٹی سی آواز میں) نہیں!...... بالکل نہیں!...... ہم یہ نہیں ہیں!...... زمین کی سطح برابر نہیں ہے!...... دو انگلیاں برابر نہیں ہیں!...... انسان بھی برابر نہیں ہیں!...... اور انسانوں کو برابری چاہیے بھی نہیں!...... انسانوں کو بس روٹی چاہیے، اور ڈنڈا چاہیے، اور میرے پاس دونوں ہیں!

گراچی: (ٹرمپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے) روٹی کھینچی بھی تو جا سکتی ہے!...... ڈنڈا چھینا بھی تو جا سکتا ہے!

ٹرمپ پر ایک دم ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔

ٹرمپ: (بہ مشکل اپنی ہنسی روکتے اور گراچی کی جانب ایک تمسخر بھری نگاہ اچھالتے ہوئے) جو روٹی چھینے گا اور ڈنڈا کھینچے گا، وہ مجھ جیسا ہی ہوگا، اور اگر نہیں بھی ہوگا تو ایک نہ ایک دن مجھ جیسا ضرور ہو جائے گا!...... پھر تمہیں اُس سے بھی روٹی چھیننی ہوگی اور ڈنڈا کھینچنا ہوگا!......اور یہ کھیل کبھی ختم نہیں ہوگا!......اور یہ جنگ یونہی چلتی رہے گی۔

گراچی: (خواب آلود لہجے میں) کوئی تو انت ہوگا اِس کا!......یہ دائرہ توڑا بھی تو جاسکتا ہے!...... ہم کوشش کریں گے !...... ایک نہ ایک دن !......ضرور!......(پھر وہ اپنی جیب سے ایک سکہ نکالتا ہے اور مودی کی جانب دیکھتے ہوئے کہتا ہے)......اِس سکے کے ایک طرف بھگوان ہے، دوسری طرف انسان ہے، ہیڈ آیا تو بھگوان ملیں گے، ٹیل آئی تو انسان ملیں گے!...... بولو کیا کہتے ہو؟

مودی: (تھوڑا بوکھلاتے ہوئے) اور ڈنڈا؟......ڈنڈا کدھر ہے؟

ٹرمپ: (فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے) وہ تو میرے پاس ہے!...... (پھر مودی کی طرف دیکھتے ہوئے)...... اِدھر آؤ نا!......دور کیوں کھڑے ہو؟......(پھر والٹیئر کی جانب مڑتے ہوئے)...... جانتے ہو نا؟......تم تو سب جانتے ہو!......یہ سب تو ارتقائی عمل میں کہیں بہت پیچھے رینگتے ہوئے کیڑے ہیں، اصل کھیل تو میرا اور تمہارا ہے!

ٹرمپ کے لہجے میں اِتنی قطعیت اور صداقت ہے کہ سب لوگ ایک دم بوکھلا جاتے ہیں اور سوالیہ نگاہوں سے والٹیئر کی جانب دیکھنے لگتے ہیں۔ والٹیئر کی آنکھوں

میں خوف کی ایک پرچھائی سی نمودار ہوتی ہے مگر اِس سے پہلے کہ کوئی اِس بات کا ادراک کر پائے، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ڈائس پر آ جاتا ہے۔

والٹیئر : (مائیک آن کرتے ہوئے) خاتون و حضرات!...... ابھی آپ نے جو فنڈا دیکھا اِسے سنگل آؤٹ میلوڈراما کہتے ہیں۔

بارتھ : (حیران ہوتے ہوئے) سنگل آؤٹ میلوڈراما؟...... میں کچھ سمجھا نہیں؟

والٹیئر : فرض کرو تم ایک بہت شاطر کھلاڑی ہو اور مخالف ٹیم کے کسی ایک نسبتاً کمزور کھیلنے والے کو پکڑ کر اُسے یقین دلانے کی کوشش کرو کہ وہ تمہارا ہم پلہ ہے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے باقی ساتھیوں سے بھی کہیں کم تر صلاحیت کا حامل ہو۔

بارتھ : (مزید حیران ہوتے ہوئے) تو اِس کا فائدہ؟

والٹیئر : (عجیب پراسرار سے انداز میں مسکراتے ہوئے) فائدہ تو بہت ہے!...... اگر اُس کھلاڑی نے شاطر کھلاڑی کی بات کا یقین کر لیا تو پھر اُس کی ٹیم میں موجود اور گراؤنڈ میں موجود ہر شخص بھی اِس بات کا یقین کر لے گا!...... اور جب وہ ہارے گا تو وہ اکیلا نہیں ہارے گا بلکہ اُس پر یقین کرنے والا، اُس پر داؤ کھیلنے والا ہر شخص ہارے گا۔

ٹرمپ: (نہایت رسان بھرے انداز میں) دیکھو والٹیئر! تم غلط آدمیوں پر جواء کھیل رہے ہو!...... میں بھی انسانیت کا بہت احترام کرتا ہوں مگر اِس کے باوجود میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ پتھر کے عہد میں جینے والوں کا صحیح مقام چڑیا گھر کے سوا اور کچھ نہیں!...... میری نیک نیتی کا اندازہ محض اِس بات سے لگا لو کہ میں اُن پر کم سے کم ٹکٹ لگاؤں گا تاکہ غریب بچوں کو سستی تفریح میسر آ سکے!

والٹیئر : (جس کے بظاہر توانا کندھے کسی ان دیکھے بوجھ سے جھکتے چلے جا رہے ہیں)
چلو! ایک لمحے کے لئے مان لیتے ہیں کہ تم جو کہہ رہے ہو، وہی سچ ہے۔ لیکن تم یہ بھی تو جانتے ہو کہ ہم کبھی متفق نہ ہو پائیں گے، لہٰذا جنگ جاری رہے گی اِس دھرتی کے سینے پر پھیلنے والی آخری رات کے سایوں تک، اور اِس کائنات کے بطن سے پھوٹنے والے آخری سورج کی روشنی تک!

ٹرمپ : (ایک دم کینچلی بدلتے ہوئے) تو پھر جیت بھی ہمیشہ کی طرح میری ہی ہوگی!

اگلے ہی لمحے ٹرمپ کے چہرے پر ایک کمینی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے، وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پستول برآمد کرتا ہے اور والٹیئر کے سینے کا نشانہ لے کر گولی چلا دیتا ہے۔

☆☆☆☆

بعد میں انکشاف ہوتا ہے کہ ٹرمپ نے کھلونا پستول سے نقلی گولی چلائی تھی، تاہم چونکہ گولی چلنے کی آواز اصلی تھی، لہٰذا والٹیئر ہارٹ اٹیک سے مر جاتا ہے، جس کا سارا الزام ایڈورڈ سعید پر تھوپ دیا جاتا ہے، جسے فرانزک شواہد اور چشم دید گواہوں کے بیانات کی روشنی میں عمر قید کی سزا سنا دی جاتی ہے۔ ایڈورڈ سعید نیویارک سٹیٹ جیل میں بھی اورینٹلزم کا پرچار جاری رکھتا ہے اور متعدد ہسپانوی اور نیگرو قیدیوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ اُنھی میں سے ایک نیگرو قیدی ''لٹل جان'' جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنا میوزیکل بینڈ بنا لیتا ہے، جس کے پہلے ہی البم ''مائی بلیک ڈِکی ڈِک'' کا ایک گانا ''فک فک وائٹ پُسی'' پورے تین مہینوں تک ہر میوزک چارٹ پر نمبر ون رہنے کے بعد، بالآخر ایک ایمی اور دو

گریمی ایوارڈ حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ٹرافی وصول کرتے ہوئے لٹل جان واضح کرتا ہے کہ یہ گانا اُس نے ایڈورڈ سعید کی زندگی اور نظریات سے متاثر ہو کر تخلیق کیا تھا ——

اُدھر سیمون ڈی بوار، پدرسری نظام کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکامی کے بعد ایک انڈر گراؤنڈ لیز بین سوسائٹی کی بنیاد رکھتی ہے، جسے بورژوا اور پیٹی بورژوا خواتین کے حلقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے، تاہم جونہی سیمون اپنے سیاسی نظریات کی ترویج شروع کرتی ہے تو ایک نسبتاً کم ریڈیکل فیسمینٹ اُس کے خلاف محلاتی سازشوں کی بنیاد رکھ دیتی ہے، جس کے نتیجے میں اُسے پریذیڈنٹ کے عہدے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ کچھ مہینوں بعد اُس سے سوسائٹی کی ممبر شپ بھی واپس لے لی جاتی ہے ——

رولاں بارتھ علمی و ادبی حلقوں میں سراہے جانے کی خواہش میں یکے بعد دیگرے تین کتابیں تحریر کرتا ہے، جن کا لبِ لباب یہ ہوتا ہے کہ افراد اور اشیاء کے ناموں کو بدلنے سے اُن کی ماہیت اور خصوصیات بھی بدلی جا سکتی ہیں، اور یہ بدلاؤ بالآخر ایک مثبت عالمی تبدیلی کو جنم دینے کا سبب بن سکتا ہے۔ بدقسمتی سے بارتھ کی کتابوں کو زیادہ پذیرائی نہیں مل پاتی، تاہم اِسی اثناء میں ایک شرپسند نقاد اُس کا نام بدل کر "ڈِلڈو" رکھ دیتا ہے، جسے دنوں ہی دنوں میں اُس کے سماجی اور غیر سماجی حلقوں میں خوب پذیرائی مل جاتی ہے۔ رولاں بارتھ کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی کہ نام کی تبدیلی کے باوجود اُس کی شخصیت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی، اور یہ انکشاف اُسے بری طرح سے ڈپریس کر دیتا ہے، مگر وہ ایک مستقل مزاج فرد کی طرح اپنے اندر تبدیلی کی خواہش کو زندہ رکھتا

ہے، اور بال آخر اپنی جنس تبدیل کروالیتا ہے۔۔۔۔

ڈونالڈ ٹرمپ تین چوتھائی اکثریت سے امریکہ کا صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی پہلی باضابطہ تقریر میں عوام کو سر کے بل الٹا کھڑا ہو کر دکھاتا ہے اور خوب داد وصول کرتا ہے، جس سے متاثر ہو کر معروف ماہر بشریات جے۔ جے۔ تھامسن ایک تحقیقی مقالہ لکھتا ہے اور ٹرمپ کو اکیسویں صدی کا بروس لی قرار دے دیتا ہے۔۔۔۔

شہرت اور کامیابی کے باوجود ٹرمپ اپنے محسنوں کو نہیں بھولتا اور صدر بنتے ہی شام، مصر اور ایتھوپیا پر حملہ کر دیتا ہے تا کہ اُس کے سپانسرز ایک ہی جھٹکے میں اربوں ڈالرز کما سکیں۔ نریندر مودی ہر محاذ پر ٹرمپ کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے چنانچہ جنگ کے خاتمے پر ٹرمپ کے ساتھ ساتھ مودی کو بھی امن کا نوبل پرائز مل جاتا ہے (ملحوظِ خاطر رہے کہ اُسی سال مرحوم والٹیئر کو بعد از مرگ ادب کا نوبل انعام دے کر ایک نئی روایت قائم کی گئی)۔

ٹرمپ حسبِ وعدہ دہلی کے نواحات میں ایک کاؤ شٹ کمپنی شروع کرتا ہے جو اگلے دس سالوں میں ایشیاء کی سب سے بڑی کاسمیٹک انڈسٹری بن جاتی ہے۔۔۔۔

سیموئیل ہٹینگٹن کی فلم ''ڈھشما'' کو چھ آسکر ایوارڈز ملے جن میں سال کی بہترین فلم کا ایوارڈ بھی شامل تھا۔۔۔۔

محسنوں کے ساتھ ساتھ، ٹرمپ اپنے دشمنوں کو بھی نہیں بھولتا۔ گرامچی کو آخری بار ''ڈھشما'' کے پریمیئر شو پر دیکھا گیا تھا۔ اُس کی گمشدگی کا زیادہ نوٹس نہیں لیا گیا۔ ساڑھے تین ماہ بعد اُس کی بیوی نے ایک پرتگالی ملاح کے ساتھ بیاہ رچا لیا اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوش و خرم زندگی گزاری۔

(اگست، ۲۰۱۶)

مصنف کی دیگر کتابیں

- ☆ نرکھ میں نرتکی (۲۰۰۶)
- ☆ کولاج (۲۰۰۹)
- ☆ ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی فیکٹری (۲۰۱۰)
- ☆ معنی کی تلاش (۲۰۲۰)
- ☆ سینٹرل چوک (زیرِ طبع)
- ☆ مونتاج (زیرِ طبع)

جب گلاب کی ٹہنی سانپ کا پھن دکھائی دینے لگے، خوشبو نتھنوں کو چیر ڈالے، موسیقی کانوں پر تازیانہ بن کر برسے، لمس پتھرا جائیں اور بوسوں سے کراہت آئے تو اُس لمحے آدمی زندگی کو طلاق دے کر موت کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے! مگر تنہا نہیں! بلکہ ایک بہت بڑا مجمع لئے! لوگوں کا کیا ہے؟ اُن کو تو بس ایک کہانی چاہیے! اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا! اُس کے پاس بہت ساری کہانیاں ہیں! وہ زندگی کے بدصورت چہروں کی کہانی سناتا ہے! وہ موت کی حسین آغوش کی کہانی سناتا ہے! وہ مرنے سے ذرا پہلے کی کہانی سناتا ہے! وہ مرنے سے کچھ بعد کی کہانی سناتا ہے! وہ نفرت سے پھنکارتے ہوئے دیوتاؤں کی کہانی سناتا ہے! وہ اپنے بزرگوں کی عظمت کی کہانی سناتا ہے! وہ اپنی عاجزی اور اخلاص کی کہانی سناتا ہے! وہ جنگوں اور بربادیوں کی کہانی سناتا ہے! وہ خیالی زندگی کا ایک بہت بڑا بت تخلیق کرتا ہے اور اُس بت کی کہانی سناتا ہے! وہ گلاب کی ٹہنی اٹھاتا ہے، اُسے سانپ کا پھن کہتا ہے اور سانپ کے پھن کی کہانی سناتا ہے! وہ لمس کو کراہت سے جوڑ کر بوسوں کی مذمت میں ہجو لکھتا ہے اور پتھرائے ہوئے جسموں کی کہانی سناتا ہے! اور لوگ سنتے چلے جاتے ہیں، اور مرتے چلے جاتے ہیں، اور آخر ایک دن سب مر جاتے ہیں!

''ڈھشما'' ایک عجیب تصنیف ہے۔ نیرّ مصطفیٰ شاید خود بھی اس کی صنف کا تعین کرنے میں کنفیوز رہا ہے سو اس نے اسے ''ڈراما ناولٹ'' قرار دے کر پیش کیا ہے۔ مجھے اسے ناولٹ قرار دینے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا کہ فکشن اپنی وحدت میں اصناف کی کثرت کا جلوہ دکھانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ناولٹ میں انسان کے ماضی و حال کی فکری و سیاسی تاریخ کے چند اہم کردار باہم ایک مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں اٹلی کا انتونیو گرامچی ہے، فلسطین کا ایڈورڈ سعید ہے، فرانس کے والٹیئر، سیمون دابوار اور رولاں بارتھ ہیں، امریکا کا سیموئیل ہنٹنگٹن ہے اور برعظیم کا گوتم بدھ۔ تاریخی کرداروں میں ماضی سے ہٹلر جب کہ حالیہ تاریخ سے ڈونلڈ ٹرمپ اور نریندر مودی کو حاضر کیا گیا ہے۔ ان سب کے مکالمے کا محور سیموئیل ہنٹنگٹن کی بنائی ہوئی فلم ''ڈھشما'' ہے اور اگر آپ کو معلوم ہے کہ نوے کی دہائی میں اس ہنٹنگٹن کی ''تہذیبوں کا تصادم'' کی تھیوری کتنی مقبول ہوئی تھی تو آپ سمجھ سکیں گے کہ کن لوگوں کے درمیان تلوارم تلوارا یا ڈھشم ڈھشما ہو رہی ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہنٹنگٹن کا مقصد تو صرف تہذیبوں کی فالٹ لائنوں کی نشان دہی تھا، تہذیبوں کی جنگ اس کا مقصد نہیں تھا، مگر فکشن کی اقلیم میں اصلی کرداروں کے ساتھ تھوڑی بہت گڑبڑ تو مصنف کا حق ہوتی ہے۔

نیرّ مصطفیٰ نے مغربی فکر کے اہم بنیاد گزاروں کے ساتھ چند تاریخی کرداروں کا گھوٹا لگا کر اسے جو فکشنی صورت دی ہے اس کی داد وہی دے سکے گا جو ان بنیاد گزاروں کے ساتھ کئی صبح و شام گزار چکا ہو اور ان تاریخی کرداروں کے بعض رویوں پر اپنے بال نوچ چکا ہو۔ اپنی زندگی گزار چکے اور اپنی فکر بتا چکے کرداروں کا ٹائپ بننا متوقع ہی ہوتا ہے مگر نیرّ مصطفیٰ کے ہاں یہ کردار اپنے دائروں سے کبھی کبھار باہر بھی نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ناولٹ ان کرداروں کے فکر و عمل پر نیرّ مصطفیٰ کا ورڈکٹ بھی ہے جو مضمون کی صنف میں کیا جاتا تو مصنف کے خیالات سامنے آنا زیادہ آسان ہوتا مگر مصنف ان کرداروں کے ساتھ جو واردات کرنا چاہتا تھا اس کے لیے فکشن ہی مناسب تر صنف تھی۔

سید کاشف رضا